پاکستان کے ریاستی اداروں کے

جزوی خدوخال



جس میں قومی دھارے کا مطلب۔

دہشتگردی سے متعلق ابحاث۔

وطنِ عزیز کے نقصانات کے ذمہ داروں کا تعین۔

مدارس اصلاحات۔

یکساں نظامِ تعلیم اور نظریہ سیکولرازم سے متعلق تفصیلات جیسے اہم امور پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

مفتی صفی اللہ صفدر

کربوغہ شریف ہنگو

نام کتاب: پاکستان کی ریاستی اداروں کے جزوی خدوخال

مصنف: مفتی صفی اللہ صفدر صاحب

تعداد: 1100

طبع: اپریل2020

ملنے کا پتہ

مفتی محمد ابراہیم صاحب

03015500966

03369404283

فہرست

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی نورالودود صاحب دامت برکاتھم العالیہ

جامعہ زکریا دارالایمان و تقویٰ کربوغہ شریف

حامدًا و مصلیاً۔۔۔۔

کسی بھی مسئلہ کا حل ہوناتب ممکن ہوتا ہے جب جواب دہندہ اپنے ذاتی مفاد اور وقتی ترجیحات کو پس پشت ڈال کر زمینی حقائق کی بنیاد پر اصول کے روشنی میں بات کریں۔ ہمارا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے دینی اور مذہبی مسائل بعض اوقات ہمارے جماعتی یا سیاسی مفاد کی نظر ہوجاتے ہیں جس کا نقصان پورے امت کو بھگتنا پڑتا ہے۔ انہی مسائل میں دینی مدارس کے ساتھ ہمارے اہلِ اقتدار کا رویہ ہے۔ برادرم محترم مفتی صفی اللہ صفدر صاحب کا محرر کردہ مجموعہ (پاکستان کی ریاستی اداروں کے جزوی خدوخال) اسی شعور کو بیدار کرتا ہے کہ محض خیالی اور بے بنیاد الزام لگاکر دینی شعائر اور مراکز کو نشانۂ تنقید نہ بنایا جائے بلکہ کسی بھی اسلامی ملک کی بقاء اور حفاظت کے لئے دینی تعلیم اولین ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موصوف کی اس کاوش کو قارئین کے لئے نفع مند ثابت کریں اور اپنی بارگاہ میں قبولیت سے نوازیں۔

بندہ نورالودود

16 شعبان 1441

پیشِ لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی والصلوۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اسلام دینِ فطرت ہے، اسلامی امور میں سے کوئی امر ایسا نہیں جو انسانی فطرت کے خلاف ہو، اگر اس کے احکامات میں غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ انسان کو ایسے امور کا مکلف نہیں بناتا جو اس کی طاقت میں نہ ہوں اور جن چیزوں کی طاقت رکھتا ہو لیکن کسی عارض کی وجہ سے معذور ہو جائے تو پھر شریعت اس کے لئے احکامات میں سہولت پیدا کرتی ہے۔ اسلام نے عورتوں کی مخصوص ساخت کے مطابق کچھ احکام ان کے ساتھ خاص کر دیئے ہیں جب کہ کچھ مردوں کے ساتھ خاص کیے ہیں۔

اگر اخلاقی تربیت پر نظر ڈالی جائے تو یہ نتیجہ حاصل ہو گا کہ جو قوم ان کو اپنائے گی رحم، شکر، حیاء، شجاعت، امانت، صداقت اور وطن سے محبت جیسی عظیم صفات سے متصف ہو گی۔

اگر اسلام کی دفاعی سوچ کو ملاحظہ کیا جائے تو یہ اخذ کیا جائے گا کہ جو لوگ اس پر عمل کریں گے وہی غالب ہوں گے۔ غلبہ حاصل کرنے کے وقت اور غلبہ کے بعد بھی رحم و کرم ان کا مصاحب ہو گا اور ان کا غلبہ فقط ظاہری نظم وضبط کی صورت میں نہیں، بلکہ دلوں کو فتح کرنے کی صورت میں بھی ظاہر ہو گا۔

اگر اس کے معاشی نقطہ نظر کو مطالعہ کیا جائے تو یہ فہم کیا جائے گا کہ اس نظریہ کو اپنانے والی قوم میں کوئی فقر اور تنگدستی اس کو پریشان نہیں کرے گی۔

اگر اس کے عقائد کو پرکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آئیگی کہ ان نظریات کا حامل شخص کبھی بھی کسی خوف و غم میں مبتلا نہیں ہو گا۔

اگر اس کے معاملات اور معاشرت کے اصولوں کو دیکھا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہو گی کہ ان اصولوں کو اپنانے والوں کے درمیان جنگ و جدل کی صورت پیش نہیں آئے گی۔

اگر اس کی عبادات پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہ افراط و تفریط سے منزہ معلوم ہوں گی اس لئے ان کے کرنے والے بھی افراط و تفریط والے نہیں ہوں گے۔

اگر اس کی انفرادی نوعیت کی تعلیمات کو معلوم کیا جائے تو ان کے حامل شخص کو مثبت فطری ذہنیت رکھنے والا اور وقت کا انتہائی قدردان پایا جائے گا جبکہ دوسری طرف اگر اس کی اجتماعی نوعیت کی تعلیمات ملاحظہ کی جائیں تو وہ نظم وضبط، اتفاق و اتحاد، عدل و انصاف اور ترقی و غلبہ کے لئے انتہائی موزوں شمار کی جائیں گی اور ان کی حامل قوم ہی اقوامِ عالم کے لیے بہترین نمونہ بلکہ ایک مقتدا ہو گی۔

بہر حال اسلام کا دینِ فطرت ہونا اظہر من الشمس ہے اس کا انکار وہی کرے گا جو دل کا اندھا ہونے کیساتھ ساتھ حاسد اور متعصب بھی ہو اور اس میں اتنا حسن ہے جس کا ادراک دل کے اندھوں نے بھی کیا ہے اور ادراک کے شدید غلبہ کی صورت میں کئی اہلِ مشاہدہ و مطالعہ نے بے اختیار اپنی گردن سے تعصب کا طوق اتار کر اس کے حسن کا کلی یا جزوی طور پر اقرار کیا ہے۔ جب اسلام دینِ فطرت ہے تو جو لوگ مختلف طریقوں سے اس کی خدمت کرتے ہیں ضروری ہے کہ ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی فطرت کے مطابق یا فطرت کے قریب ہو اور ان کے اخلاق، نظم وضبط وغیرہ میں وہ فطری حسن اور ان کو وہ

سکون و اطمینان حاصل ہو جو دین سے کم تعلق رکھنے والوں اور اس کے انکار کرنے والوں کو نصیب نہیں ہوتا ہے۔

اس مختصر رسالہ سے بندہ کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ جو لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہیں ان کی زندگی فطرت کے مطابق ہوتی ہے پھر نظم و ضبط، ترقی، غلبہ، سکون اور اطمینان وغیرہ میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں صحیح معنوں میں اسلام کے خادمین بنائے۔ آمین

ملک کا آئین کیا ہوتا ہے؟

ریاست میں مختلف ادارے اپنی مخصوص خدمات ریاست کو فراہم کرتے ہیں ،خواہ وہ پارلیمنٹ ہو یا فوج و عدلیہ ،شعبہ میڈیکل ہو یا تعلیمی شعبہ جات وغیرہ ہوں ،ان اداروں کی ان خدمات کو سراہا جاتا ہے جو آئین کے موافق ہوں کیونکہ آئین ہی میں ریاست کا منشاء و مذاق پایا جاتا ہے جو عوام کے جذبات حقوق و فرائض وغیرہ کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جاتا ہے۔

اس لئے آئین کے تقدس کی بات کی جاتی ہے اور آئین کی سبوتاژی کو ریاست اپنا وجود کھو بیٹھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حکومت کی یہ ذمہ داری قرار دی جاتی ہے کہ وہ ایسا کوئی ادارہ نہ بنائے جو آئین سے بالاتر یا اس کے خلاف ہو اور نہ ہی ایسا کوئی قانون بنائے جو آئین سے متصادم ہو، نیز جو ادارہ اپنے آئینی حدود سے تجاوز کرے اس کو آئین کے پابند بنائے تاکہ یہ سارے ادارے صحیح معنوں میں عوام کی خدمت کر سکیں۔

لہذا کسی ایک ادارہ کو ریاست سے تعبیر کرنا درست نہیں اور نہ ہی کسی ادارہ پر آئین کی روشنی میں اعتراض و تنقید کرنے کو بغاوت کا نام دیا جاسکتا ہے، بلکہ ایک مخلص شخص و ادارہ کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوپر کئے گئے اعتراض کو کھلے دل سے سنتا ہے اور پھر ٹھنڈے دماغ سے اس پر سوچتا ہے اور کوتاہی معلوم ہونے کی صورت میں معترض کا شکریہ ادا کرتا ہے اور کوتاہی کا ازالہ کرتا ہے۔

کیا مدارس ریاستی ادارے ہیں؟

وطنِ عزیز میں دیگرر اداروں کی طرح مدارس کا بھی ایک بہت بڑا جال پھیلا ہوا ہے جن میں لاکھوں طلبہ و طالبات زیرِ تعلیم ہیں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مدارس ریاستی ادارے ہیں یا نہیں؟

اس کے لیے ہمیں پہلے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ کسی ادارے کو ریاستی ادارہ قرار دینے کا معیار کیا ہے؟ریاست کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ بعض حضرات ریاست فقط عوام کو کہتے ہیں اور بعض عوام، علاقہ اور حکومت کے مجموعے کو کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان تعریفات کو بغور دیکھیں تو ان میں عوام رکن جیسی حیثیت رکھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اگر کہیں عوام ہی نہیں تو حکومت کس پر کی جائے گی اور ریاستی ادارے کس کے لئے اپنی خدمات سر انجام دیں گے ؟ جب ریاست عوام کا نام ہے تو ریاستی ادارہ بھی وہی کہلایا جائے گا جو عوام کی خدمت میں مصروف ہو۔

عوام کی ایک بڑی تعداد عملی طور پر مدارس سے منسلک ہے اور ان کے وجود کو ضروری بھی قرار دیتے ہیں، اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد اہلِ مدارس کی مالی معاونت کرتے ہیں اور ایک بڑی تعداد کے نیک جذبات اہلِ مدارس کے ساتھ ہوتی ہیں ،ان کو ریاست کے نظریہ کے محافظ سمجھتے ہیں اور ریاست کے نظریاتی واسلامی تشخص بر قرار رکھنے کو انتہائی اہم سمجھتے ہیں جس کو لاکھوں مسلمانوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کر کے حاصل کیا ہے۔

نیز یہ مدارس آئین کے اسلامی دفعات کے متقاضی اور ان کے اجراء کے لیے بڑی حد تک کار آمد ہیں۔ چنانچہ آئینِ پاکستان 1973ء کے آرٹیکل 31 میں ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لیے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اقدامات کئے جائیں گے جن کی مدد سے وہ قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہی کام اہلِ مدارس احسن طریقہ سے سر انجام دیتے ہیں۔

بہر حال اگر عوام دینی علوم میں اتنی دل چسپی لیتے ہوں اور یہ علوم آئین اور اشاعتِ دین کے متقاضی بھی ہوں پھر عوام از خود ان علوم سے متعلق ادارے (مدارس) بنائیں۔ تو کیا انہیں ریاستی ادارے نہیں کہا جائے گا؟ حالانکہ جو ادارے آئین کے دائرہ میں رہ کر عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں ان کو ریاستی ادارے کہا جاتا ہے جیسا کہ پرائیویٹ سکولز وغیرہ۔ اور ان کو ریاستی ادارے کہنا درست بھی ہے کیونکہ ریاست کے مختلف ادارے تو عوام کے حقوق و ضروریات بلکہ سہولت پورا کرنے کے لیے ہی معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

بالفرض اگر ریاستی ادارہ اس کو کہا جائے جس کو حکومت نے بنایا ہو اور حکومت ہی اس کے اخراجات برداشت کرتی ہو، پھر تسلیم کرتے ہیں کہ مدارس ریاستی ادارے نہیں لیکن پھر بھی حکومت کو اہلِ مدارس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جس طرح ریاست میں جو لوگ اپنے لئے کام کرتے ہوں اور ریاست کو ان سے کچھ نفع ہو تو ان کی کتنی دل جوئی کی جاتی ہے جیسا کہ تاجر برادری وغیرہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ تو کیا ریاست میں قرآن وحدیث کی ترویج ریاست کو نقصان پہنچاتی ہے کہ جس کے وجہ سے بعض افراد ان سے نالاں ہیں۔

کیا مدارس قومی دھارے میں شامل ہیں؟

وطنِ عزیز میں "قومی دھارا" ایک ایسا فلسفہ ہے جس کا مفہوم کہنے والے کے علاوہ کسی اور کی سمجھ میں نہیں آتا اور یہ ایک ایسا ڈھال بن چکا ہے جس کو ہر حکومت اپنے مفاد و پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فاٹا کو قومی دھارے میں شامل کرو، حالانکہ فاٹا تو پہلے ہی سے وفاق کے زیرِ انتظام ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں جماعت کو قومی دھارے میں شامل کرنا ہے حالانکہ اس جماعت کے لوگ اسمبلیوں کی

زینت بنے ہوتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ فلاں کالعدم تنظیم کو قومی دھارے میں شامل کرو حالانکہ وہ تنظیم اپنے انہی پرانے اصول وضوابط کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے پہلے حکومت میں قومی دھارے کا حصہ شمار ہوتی چلی آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرتے ہیں حالانکہ سالہاسال پہلے مدارس کے درجہ عالمیہ کی سند کو ایم اے کے برابر کا درجہ دیا گیا ہے اور بہت سے علماء ان اسناد کی بنیاد پر مختلف سرکاری ذمہ داریاں ادا کررہے ہیں۔ اسی طرح دیگر کئی اشخاص وگروپوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو قومی دھارے میں شامل کرتے ہیں۔

جن جن جماعتوں اور اداروں وغیرہ کو حکومتوں نے قومی دھارے سے باہر قرار دیا ہے اگر ان لوگوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک جیسی سرگرمیوں میں مبتلا نہیں بلکہ ان کی سرگرمیاں مختلف تھیں۔ لہٰذا اس سے کوئی نتیجہ نکال کر یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کن سرگرمیوں کی بنیاد پر کوئی فرد یا ادارہ قومی دھارے سے باہر سمجھا جائے گا اور یہی وجہ ہے کہ "قومی دھارے" کا مطلب اب تک معلوم نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ وطنِ عزیز میں بعض لوگ ایسی سرگرمیوں میں بھی مبتلا ہیں جو نہ اسلام کے مفاد میں ہیں اور نہ ہی پاکستان کے مفاد میں ہیں مثلاً فحش فلمی کلبز چلانے والے ادارے اور اسلام کے خلاف زہر پھیلانے والے ادارے (بعض میڈیا چینلز) وغیرہ لیکن حکومتیں ان کو قومی دھارے سے باہر نہیں سمجھتیں۔ حالانکہ آئین کے منشا کے مطابق وہ قید کرنے یا ملک بدر کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔ (کاش کہ لاپتہ افراد اسی نوعیت کے لوگ ہوتے یعنی ان ہی لوگوں کو لاپتہ کیا جاتا جو اسلام کے خلاف زہر پھیلا رہے ہیں کیونکہ وطنِ عزیز کے لئے سب سے بڑا ناسور یہی لوگ ہوتے ہیں۔)

اس طرح حکومتی اصلاحات کے خلاف مہینوں تک اداروں کو بند کر کے احتجاج کرنے والوں کو بھی قومی دھارے سے باہر تصور نہیں کیا جاتا جیسا کہ ابھی قریب کے زمانہ میں ڈاکٹروں نے ہسپتال بند کر کے طویل المدت احتجاج کیا جبکہ اپوزیشن جماعتوں کا تو گویا یہی وتیرہ بن چکا ہے کہ وہ قانون سازی اور اصلاحات کی صورت میں حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اگر ایک آزاد ماحول میں قومی دھارے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ تعریف ذہن نشین ہوتی ہے کہ ریاست کے آئین کو چیلنج نہ کرنے اور اس کے خلاف سرگرمیوں میں مبتلا نہ ہونے کو قومی دھارا کہا جاتا ہے۔ باقی اگر کوئی آئین کے کسی آرٹیکل کے خلاف کرتا ہے یا کوئی قانون توڑتا ہے تو اس کی وجہ سے وہ قومی دھارے سے نہیں نکلتا ورنہ پھر آدھے یا اس سے بھی زیادہ پاکستانی قومی دھارے سے نکل جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ جو ریاست کے لیے کوئی بھی خدمت نہیں کرتے اور فضول وقت خرچ کرنے کے ساتھ ریاست پر ایک گنا بوجھ ہیں جیسا کہ عوام کی ایک تعداد ہیں وہ بھی قومی دھارے سے باہر نہیں۔ تو گویا آئین کو چیلنج کرنے والے اور آئین کے خلاف بغاوت کرنے والے لوگوں کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ قومی دھارے سے باہر ہیں اور ان کے علاوہ قومی دھارے کے اندر رہیں۔ واللہ اعلم

اب اہلِ مدارس کو دیکھیں کہ آئین کے خلاف بغاوت تو دور کی بات ہے یہ تو آئین کے خلاف بھی نہیں کرتے بلکہ وہ تمام کام کرتے ہیں جو آئین کا تقاضا ہے۔ وطن سے محبت کرنے والے اور حکومتی اتھارٹی کو قبول کرنے والے ہوتے ہیں، باقی قومی دھارے سے باہر تصور کرنے کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ حکومتِ وقت کسی ادارے کو قومی

دھارے سے باہر قرار دے کیونکہ آئین کی پاسداری اگر ایک عام شہری کے لیے ضروری ہے تو حکومتی کارندوں اور ریاستی اداروں کے عہدیداروں کے لئے اس سے بڑھ کر ضروری ہے تو جس طرح ایک شہری کو قانون کی خلاف ورزی کی بناپر آئین شکن ہے، قومی دھارے سے باہر قرار دیا جاسکتا ہے تو اسی طرح حکومتی کارندوں اور ریاستی اداروں کے عہدیداروں کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا۔ لہٰذا حکومت کا کسی کو یہ کہنا کہ یہ قومی دھارے سے باہر ہے اس سے یہ لازم نہیں کہ وہ باہر ہی ہو، بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کہنے والے حکومتی ذمہ داران اور ریاستی اداروں کے اہلکار خود قومی دھارے سے باہر ہوں۔ پس قانون شکنی کا الزام لگاکر مدارس کو قومی دھارے سے باہر ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اگر قومی دھارے میں لانے کے لیے حکومت کا معیار یہ ہو کہ اہلِ مدارس سالانہ آڈٹ رپورٹ حکومت کو جمع کرائیں گے۔ تو اس معنی کے لحاظ سے بہت سے عصری تعلیمی ادارے بھی قومی دھارے سے باہر ہو جائیں گے کیونکہ عصری تعلیمی ادارے بھی سالانہ آڈٹ رپورٹ حکومت کو جمع نہیں کراتے۔ اسی طرح اگر اس کا معیار یہ ہو کہ مدارس کے طلبہ کے امتحانات حکومتی بورڈز لیں گے اور اسناد بھی وہ جاری کریں گے تو اس معنی کے لحاظ سے یونیورسٹیاں بھی قومی دھارے سے خارج ہو جائیں گی کیونکہ یونیورسٹیوں کا امتحان حکومتی بورڈ کے تحت نہیں ہوتا بلکہ پروفیسرز خود پرچے تیار کرکے طلبہ سے امتحانات لیتے ہیں اور ڈگریاں دیتے ہیں اور امتحانات بھی اس نصاب کے مطابق لیتے ہیں جو وہ پڑھا چکے ہوتے ہیں۔

اسی طرح حکومتی بورڈ تو ایک نہیں بلکہ وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام عصری تعلیمی اداروں کا ایک نصاب اور ایک بورڈ ہوتا ہے اور صوبائی حکومتوں میں ایک ایک صوبہ میں

کئی بورڈ ہوتے ہیں ۔ ہر صوبہ کے بورڈز اپنے نصاب کے مطابق امتحانات لیتے ہیں اور سرٹیفیکیٹ جاری کرتے ہیں۔ تو اسی طرح مدارس کا بھی ایک علیحدہ بورڈ ہے جس کو حکومتوں نے تسلیم کیا ہے۔

کیا حکومت مدارس کے ساتھ قومی اداروں کی طرح کا رویہ رکھتی ہے؟

حکومتی رویوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدارس کے ساتھ قومی اداروں جیسا سلوک کرتی ہے، اور ان کو ایک قومی ادارے کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ حکومت وفاق المدارس کے اسناد کو باقاعدہ اعتبار دیتی ہے، وفاق کے زیر انتظام مساجد اور فوجی چھاؤنیوں اور قلعوں میں تقرری کے لیے فقط یہی اسناد ہی کارآمد ہوتی ہیں اسی طرح اسکول کے استاد اور لیکچرر بننے وغیرہ میں یہ اسناد کردار ادا کرتی ہیں، ان کے ذریعہ سے ایک آدمی رکن اسمبلی، وزیر حتیٰ کہ وزیر اعظم کے منصب پر بھی فائز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مدارس کے جملہ معاملات (رجسٹریشن وغیرہ) وزارتِ تعلیم سے متعلق کئے گئے ہیں۔ اور باہمی معاہدہ کے تحت مدارس کے درجہ متوسطہ میں انگریزی، ریاضی، معاشرتی علوم وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں نیز مدارس کا امتحانی بورڈ اور اسکے اسناد بھی معاہدہ ہی کے تحت تسلیم کئے گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

قومی ادارے ایک جیسے نہیں ہوتے؟

یہ معلوم ہوا کہ مدارس قومی دھارے میں شامل ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومتیں ان کے ساتھ قومی اداروں جیسا سلوک کرتی آرہی ہیں اب سوال یہ ہے کہ پھر کچھ لوگوں کے طرف سے یہ تاثر کیوں دیا جاتا ہے کہ مدارس ریاستی ادارے نہیں ہیں؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ (جو در حقیقت غلط فہمیوں پر مبنی ہے) کی تفصیل یہ ہے کہ ریاستی ادارے ایک جیسے نہیں ہوتے بعض سرکاری ہوتے ہیں ان کی خدمات، اختیارات، طریقہ کار اور مراعات وغیرہ میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً فوجی ادارے کو دیکھیں کہ اس کو مختلف اختیارات سپرد کیئے گئے ہیں حتی کہ کئی مرتبہ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں، فوج کا اپنا ایک لباس ہوتا ہے اور اپنے مخصوص مراعات بھی ہوتے ہیں مثلاً ان کے اپنے ہسپتال اور سکول ہوتے ہیں وغیرہ، اس طرح چھٹی لینے کے لیے اور بدعنوانی کی صورت میں اس ادارہ کا ایک نظم موجود ہے اور اس ادارہ کے قیام کا مقصد سرحدات کی حفاظت ہے۔ جبکہ ڈاکٹرز اور سکول کے اساتذہ وغیرہ ان امور میں فوجیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور بعض ادارے غیر سرکاری ہوتے ہیں جیسا کہ دینی مدارس اور پرائیویٹ سکولز وغیرہ۔ لیکن چونکہ اہلِ مدارس اتنا بڑا نیٹ ورک اپنی مدد آپ کے تحت بہت ہی منظم اور احسن انداز میں چلاتے ہیں جو کہ یقیناً ان کا ریاست کے اوپر بہت ہی بڑا احسان ہے اور ریاست کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے میں مرکزی کردار ادا کررہے ہیں جو کہ ریاست پاکستان کا بنیاد اور آئین کا تقاضا ہے۔

بہر حال مدارس کا اپنی مدد آپ کے تحت چلنے ہی سے بعض عوام کو یہ خیال آیا کہ یہ ریاستی ادارے نہیں ہیں چونکہ ان کو ریاستی ادارہ کا مطلب اور مدارس کا حکومتوں کے ساتھ معاہدات وغیرہ جیسے امور کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ مدارس کے بارے میں درست تاثر قائم کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تاثر حکومت یا بعض ریاستی ادارے یا ان کے بعض افراد پھیلا رہے ہیں۔ اگر یہ تاثر حکومت یا کوئی ریاستی ادارہ پھیلا رہا ہے تو ان کے بارے میں

عرض یہ ہے کہ ان کی ذہنیت اور ارادوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے البتہ ظاہری طور پر یہ ایک بیرونی دباؤ ہے اور اس دباؤ ہی کے تحت وہ مدارس کے لیے نئی قانون سازی اور ان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوئی تجزیہ نہیں بلکہ حقیقت ہے جو بار بار میڈیا کے ذریعہ سے ہم سنتے ہیں مثلاً 22 دسمبر 2019ء کو مختلف اداروں نے ایک رپورٹ شائع کی۔ بندہ صرف ''نوائے وقت'' کی رپورٹ سے کچھ اقتباسات نقل کرتا ہے:

اسلام آباد (نمائندہ خصوصی، نوائے وقت رپورٹ) فنانشل ایکشن ٹاسک فورس نے پاکستانی سفارشات پر عمل کے بارے میں بھیجی جانے والی رپورٹ پر غور کے بعد مدارس کے متعلق کئے گئے قانونی اقدامات کی تفصیلات مانگی ہیں۔ ذرائع کے مطابق پاکستان کو ''ایف اے ٹی ایف'' کی جانب سے 150 سوالات پر مشتمل سوالنامہ موصول ہوا ہے ۔کالعدم تنظیموں کے خلاف درج مقدمات کی نقول بھی مانگی گئی ہیں۔ پاکستان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ کالعدم تنظیموں سے منسلک افراد کو سزا دلوائی جائے۔۔۔۔۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ پاکستان کی رپورٹ پر ایف اے ٹی ایف نے 150 سوالات بھی بھجوائے ہیں۔ سوالات ای میل کے ذریعے پاکستانی حکام کو بھیجے گئے ہیں۔ ان سوالات میں پاکستان میں مدرسوں سے متعلق زیادہ وضاحتیں طلب کی گئی ہیں۔

اسلام مخالف عناصر کب خوش ہوں گے؟

اب حکومت کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کتنا دباؤ قبول کرنے کو تیار ہے اور وطنِ عزیز اور اس کے باشندوں پر کس حد تک سختیاں اور آزمائشیں ڈالنے کا ارادہ ہے۔ کیونکہ مغرب کے مطالبات نہ تو اسلام کے لئے بہتر ہوتے ہیں اور نہ پاکستان کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ اگر حکومت کا خیال ہے کہ ہم ایک حد تک ان کے ساتھ جاتے ہیں تاکہ وہ ناراض نہ ہو جائیں تو

یہ ایک خام خیالی ہے۔یہود و نصاریٰ کسی سے اس وقت تک راضی نہیں ہوتے ہیں جب تک ان کے دین کو نہ اپنایا جائے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے **ولن ترضیٰ عنك الیهود ولن النصری حتی تتبع ملتهم** ”ہر گز یہود و نصاری آپ سے راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کی تابعداری کریں“۔ تو ایسی صورت حال میں یہ ضروری ہے کہ بروقت ان کے دباؤ سے نکلے تا کہ ایک آزاد ریاست کے طور پر اپنے فیصلے خود کرے۔ اگر چہ کچھ وقت کے لیے پابندیاں لگیں لیکن ان شاءاللہ پھر آسانی پیدا ہو گی **ان مع العسر یسرا** ”بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہوتی ہے“۔

بعض حضرات کا خیال

اور اگر حکومت یا ریاستی اداروں کے کچھ افراد یا بعض عوام یہ تاثر پھیلا رہے ہیں تو یہ افراد پھر دو قسم پر ہیں:

ایک قسم وہ ہے جو اس بنیاد پر اشکالات کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کو نفع بخش نہیں سمجھتے اور اس کے متعلقہ افراد (کو مال کے لحاظ سے قدرے کمزور سمجھ کر ان) پر ترستے ہیں کہ ان بے چاروں کے روز گار کا کیا ہو گا اور ان کو کوئی اہم منصب نہیں مل سکتا۔ یہ معاشرے میں زندگی کیسے گزاریں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ حضرات مخلص ہوتے ہیں لیکن ان کا ہدف چونکہ فقط مال کا حصول ہوتا ہے اور مال ہی کو عزت و اطمینان پانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں ان کے دلوں میں مالدار کا اکرام ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی ذریعہ سے مالدار بنا ہوا ہو چاہے سود کے ذریعہ سے ہو یا حلال کسب کے ذریعہ سے، اعلیٰ اخلاق کا حامل ہو یا اخلاق سے بالکل عاری، خواہ وہ عالمِ دین ہو یا اسکے علاوہ۔ لیکن پہلے معلوم ہوا کہ مدارس کے اسناد سے اہم عہدے حاصل کئے جاسکتے ہیں جس کے ذریعہ پیسہ کمایا جا سکتا ہے لیکن اکثر علماء سند کے

ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے اشاعتِ دین و حفاظتِ دین کی خاطر تدریس وغیرہ دینی خدمات سرانجام دینے کے لئے کمربستہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ہدف دنیا کی فانی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہوتی ہے اور دنیاوی امور میں فقط ضروریات پورا کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جبکہ بعض سرکاری ڈیوٹیاں اور کاروبار وغیرہ بھی کرتے ہیں۔

مذکورہ دونوں قسم کے علماء احسن طریقہ سے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے ہیں ۔نہ تو بے روزگاری سے خودکشی کرتے ہیں اور نہ ٹینشن کی گولیاں کھاتے ہیں اور نہ ہی تنخواہوں کی کمی کی وجہ سے روڈ بلاک کرتے ہیں بلکہ معاشرہ میں عزت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور معتمد لوگ ہوتے ہیں ان کے اجتماعات میں ہزاروں بلکہ لاکھوں تک لوگ جان ،مال اور وقت خرچ کر کے جمع ہوتے ہیں۔ جہاں تک مدارس کے نفع بخش ہونے یانہ ہونے کی تفصیل ہے تو وہ ان شاء اللہ تفصیل کے ساتھ آئے گا البتہ ان حضرات کی خدمت میں گزارش یہ ہے کہ وہ مدارس پر اعتراضات کے بجائے حکومت پر اعتراض کریں کہ ان کثیر تعداد لوگوں کے جذبات کی قدر کرنی چاہیے، ان کے علم کے مطابق ان کو کام کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں، ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور ان کی تحقیقات و خدمات کو بہترین انداز میں قوم کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ اور حکومت سے مطالبہ کریں کہ آئین کے تقاضوں کے مطابق ملک میں اسلامی نظام رائج کیا جائے اور سود کی نحوست سے وطنِ عزیز کو پاک کیا جائے تو پھر عدالتوں اور بنکوں وغیرہ کی ذمہ داریاں بھی یہی فارغ التحصیل علماء احسن طریقہ سے نبھاسکتے ہیں ،اور پھر مختلف اسلامی تحقیقاتی ادارے حکومت کی ضرورت بن جائیں گے۔ اس طرح وفاق المدارس کے اسناد کے درجہ کو اور بڑھا دیں، اور حکومت سے سوال کریں کہ کیا وجہ ہے کہ پہلی کا قاعدہ الف آم اور ب بلی پڑھانے والے کو

خواندہ قرار دیا جاتا ہے اور مدارس کے فارغ التحصیل کو ناخواندہ قرار دیا جاتا ہے ؟لہذا ان کو خواندہ قرار دیکر ان کے معاش کا مسئلہ حل کیا جائے۔

دیکھیں حکومت کرکٹ کے شائقین کے جذبات کا کتنا لحاظ رکھتی ہے، کرکٹ کا باقاعدہ ایک بورڈ بنایا ہے اور میڈیا میں کتنا نمایاں کرکے پیش کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے بعض حضرات کا خیال

دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو مدارس کے نصاب تعلیم ہی کو ہدف بناتے ہیں اور اس کے حاصل کرنے والوں کو پتھر کے زمانے والے قرار دے کر مختلف قسم کے تجزئے کرتے ہیں۔ اور توہمات پھیلاتے ہیں، اگر ان لوگوں کا اعتراض قرآن مجید، احادیثِ مبارکہ اور دینِ اسلام پر ہو پھر تو یہ اپنے بارے میں خود سوچیں ایسی صورت میں یہ بحث اس رسالہ کا موضوع نہیں۔ اور اگر وہ اسلام کو ایک پُر امن مذہب تصور کرتے ہیں اور تا قیامت رہنمائی والا مذہب قرار دیتے ہیں تو پھر ان کو مدارس پر اعتراض کیوں ہے ؟ مدارس کا نصاب تو قرآن مجید، احادیثِ مبارکہ اور ان سے متعلقہ فنون کا مجموعہ ہے۔ ان کو ملک کے سودی نظام پر کیوں اعتراض نہیں ہوتا جس نے ملکی معیشت کا کیا حال کیا؟ قومی کرکٹ کے اداروں پر کیوں اعتراض نہیں ہوتا؟ جس نے نوجوانوں کے عمروں کی کتنی بہاریں ضائع کی ہیں۔ فحاشی کے کلبز اور ویلنٹائن ڈے، مخلوط نظامِ تعلیم وغیرہ پر کیوں اعتراض نہیں ہوتا جنہوں نے مضبوط خاندانی نظام کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے اور نوجوانوں کی تعلیم میں اتنا خلل پیدا کیا ہے اور طلبہ کی یکسوئی کو اتنا متاثر کیا ہوا ہے کہ گویا اب تعلیم فقط سرٹیفکیٹ حاصل کرنے ہی کا نام رہ گیا ہے ۔ بہرحال ان حضرات کے اعتراضات، تجزیات اور توہمات کو ایک نظر دیکھتے ہیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے ؟

پہلا اشکال

﴿مدارس سے فارغ التحصیل حضرات تنگ نظر ہوتے ہیں﴾

اس کا جواب یہ ہے کہ تنگ نظری اور آزاد خیالی کے پیمانے جدا جدا ہیں تقریباً ہر شخص ایک اعتبار سے تنگ نظر ہوتا ہے اور دوسرے حوالہ سے آزاد خیال ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنے بیٹوں کے بارے میں اس لحاظ سے تو آزاد خیال ہے کہ دین سیکھیں یا نہیں اس کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن دوسری طرف اگر وہ اسکول نہیں جاتے تو وہ بہت تنگ نظر ہوتا ہے اور چھوٹے بچوں کو سکول جانے پر ضرور آمادہ کرتا ہے۔ اس طرح بعض ریاستوں کو دیکھ لیں کہ وہ آزاد خیالی وسیکولرزم کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کی ترقی اور ان کی کثرت برداشت نہیں کرپاتے، آزادی اظہار رائے کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن ریاستی اداروں کے خلاف درست بات کو بھی برداشت نہیں کرتے بلکہ ان جیسی باتیں کرنے والے کو ریاست کا غدار قرار دیتے ہیں۔ اس طرح آزادی اظہار رائے کی آڑ میں مسلمانوں کی مقدس عبادت جہاد کو تو دہشت گردی قرار دینے سے نہیں تھکتے لیکن ساتھ ہی مسلمانوں پر بمباری کرنے سے بھی نہیں تھکتے۔ حالانکہ جہاد اور دہشت گردی کے درمیان کوسوں دور تک بھی کوئی ربط نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تقریباً آدھی دنیا فتح ہوچکی تھی لیکن اس میں ٹوٹل کتنے آدمی مارے گئے تھے ؟ اگر فقط عربوں کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر وہ اسلام نہ لاتے تو ذاتی جنگ وجدل میں جہاد میں مارے جانے والوں سے کئی گنا زیادہ لوگ مارے جاتے۔ پھر اس جہاد کا نتیجہ اس امن وامان کی صورت میں نکلا کہ امیر المومنین گارڈ کے بغیر راتوں کو رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لئے مملکت کا چکر لگاتے اور کہتے کہ جس میت کا قاتل معلوم نہ ہو تو حکومت اس کی قاتل ہے، اگر ریاست میں کتا بھوک سے

مر جائے تو اس کا جواب دہ حکمران ہو گا، معیشت کا یہ حال ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک وقت ایسا آیا کہ زکوۃ لینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

اب دہشت گردی کو ایک لمحہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں، امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر دو لاکھ چالیس ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس کے بعد جاپان ہی کے دوسرے شہر ناگاساکی پر دوسرا بم گرا کر وہاں قیامت برپا کر دی۔ اس کے علاوہ امریکہ نے بیس اور ملکوں پر مختلف اوقات میں بم برسائے جن میں لاکھوں لوگوں کو مار ڈالا۔ پھر اس کے نتیجہ میں جو امن آیا وہ آپ کے سامنے ہے (اگر موقع ملا تو امریکہ کی داخلی صورتِ حال پر بھی ان شاءاللہ کچھ لکھوں گا جس سے معلوم ہو گا کہ وہاں کی داخلی صورتِ حال کتنی خراب اور لوگ امن وسکون کے لیے کتنے پریشان ہیں۔)

اسلام اور جدید ایجادات

اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے وہ روشن ہدایات ہیں جو اس کے علاوہ دوسرے کسی بھی نظامِ زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ اس نے کبھی بھی اپنے ماننے والوں کو ایجادات و ترقی سے منع نہیں کیا بلکہ کائنات میں غور و فکر کرنے کو بہترین عمل قرار دیا ہے۔ البتہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ ترقی کرنے کے لئے غیر شرعی امور سے اجتناب کیا جائے۔ لہذا مذہب اور دینی تعلیمات پر اس سے بڑھ کر کوئی بہتان نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ روز افزوں ترقیات کے دروازے اپنے ماننے والوں پر بند کرتا ہے یا علومِ دینیہ کی اشاعت دنیوی ترقیات کے منافی ہے البتہ مذہب تمام انسانی ایجادات کی نگرانی ضرور کرتا ہے کیوں کہ اس کی بقا و ارتقا اور استحکام کے لیے شدید ضرورت ہے کہ ان کا استعمال صحیح اور برمحل ہو، خالقِ کائنات کے منشاء کے خلاف نہ ہو، انسانیت کی فلاح و

بہبود کے لیے استعمال کیا جائے، کمزور قوموں کو مغلوب و مقہور کرکے ان کے ملکوں کے ذخائر پر ڈاکہ ڈالنے کی غرض سے ہرگز ان سے کام نہ لیا جائے وغیرہ۔

لہٰذا علومِ دنیا و علومِ آخرت میں کوئی نزاع و تصادم نہیں، اسلام میزائل بنانے پر کوئی پابندی نہیں لگاتا، ہاں اس کے استعمال کا طریقہ کار و وقت کا تعین ضرور کرتا ہے کہ تمام آلاتِ جنگ ملک و ملت کے دفاع اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ظلم و عدوان کا مقابلہ کرنے اور دنیا میں امن و امان پیدا کرنے اور اس کو باقی رکھنے کے لئے استعمال کئے جائیں۔

کیا علماء ترقی کے راہ میں رکاوٹ ہیں؟

علمائے کرام نے نہ تو کبھی ایجادات سے منع کیا ہے اور نہ ہی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عصری تعلیم کے خلاف ہیں۔ وہ اگر مخالفت کرتے ہیں تو عورتوں کے پردہ کے بغیر تعلیم حاصل کرنے کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عورتیں تعلیم حاصل کریں، کوئی کام کرنا چاہیں (ڈاکٹر وغیرہ بننا چاہیں) تو کرلیں لیکن بے پردگی سے بچیں اور پردہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے رکاوٹ بننا تو دور کی بات ہے بلکہ یہ تو تعلیم کے حصول کے لئے بہت اہم ہے۔ اگر خالی الذہن ہو کر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس طرح بے پردہ تعلیم حاصل کرنے سے خود طلبہ و طالبات کے تعلیم بھی کافی متاثر ہوتی ہے۔ یکسوئی جو مضبوط تعلیم حاصل کرنے کے لئے شرط جیسی حیثیت رکھتی ہے یہ بے پردگی اس یکسوئی پر کافی خلل انداز ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایک کثیر تعداد میں سے صرف چند ہی طلبہ قابل ہوتے ہیں باقی ڈگری تو حاصل کرتے ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرپاتے کیونکہ اس نظام میں طلباء میں دوستیوں وغیرہ کی وجہ سے وقت کے ضیاع کا طوفان برپا ہو چکا ہے۔ جبکہ مضبوط

تعلیم کا حصول وقت کی قدردانی پر موقوف ہے یہی وجہ ہے کہ مغرب کے کئی قابل پروفیسروں نے مخلوط نظام کو طلبہ و طالبات کے تعلیم کے لیے ناسور قرار دیا ہے۔ مثلاً امریکی صحافی خاتون مشال کونن اپنے ایک مضمون "مخلوط تعلیم اور اس کے مضمرات" میں تعلیمی کونسل کے سربراہ سپیلن کے الفاظ نقل کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ "تعلیم غیر مخلوط ہونی چاہیے ورنہ لڑکے لڑکیاں دونوں پڑھائی میں کمزور ہوتے چلے جائیں گے اور اس کا خمیازہ مستقبل میں معاشرہ کو بھگتنا پڑے گا"۔ پس اگر غیر شرعی امور کے ارتکاب سے علماء کا منع کرنا تنگ نظری ہے تو یہ واقعی ناانصافی ہے۔

باقی عورتوں کے باپردہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تو علماء نے ہزاروں مدارس قائم کئے ہیں، علماء عورتوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ مساوات نہیں بلکہ عدل وانصاف کے بات کرتے ہیں اسی لئے تو خاوند پر بیوی کا نفقہ واجب قرار دیتے ہیں خواہ خاوند فقیر ہو یا مالدار، اور خواہ بیوی فقیر ہو یا مالدار۔ پھر عورت پر نفقہ کا بوجھ نہ ہونے کے باوجود ان کو میراث دینے کے لیے آواز اٹھاتے ہیں، عورتوں کی تعظیم کرنے والے ہوتے ہیں، اجنبی عورتوں سے بدتمیزی تو دور کی بات ہے بلکہ آنکھیں نیچے کرکے آگے چلتے ہیں۔ نکاح میں ان کی رضامندی کو ضروری قرار دیتے ہیں اور نکاح کے بعد ناچاقی کے صورت میں اس کی حل نکالتے ہیں۔

دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی کو دیکھیں کہ وہاں کسی کو بھائی، بہن کا نام بھی آئے تو یہ بھی غنیمت ہے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور تکلیف کے وقت ان کا کام آنا تو دور کی بات ہے وہاں پر تو عورتوں کو مالِ تجارت بنایا گیا ہے۔ ان کی تصویروں اور جسم فروشی کی ویڈیوز پر اربوں ڈالر کمائے جاتے ہیں۔ چونکہ اسلام میں عورت پر معیشت کا کوئی بوجھ نہیں

ہوتا اس لئے ان کی اکثریت چند روپیوں کے عوض دوسروں کی نوکری کے بجائے اپنے خاوند کی خدمت کو اپناتی ہیں۔ اور سب کچھ وہ اپنی مرضی، خوشی اور ذوق و شوق سے اپناتی ہیں۔ شاید مغربی یا مغرب زدہ عوتوں کو یہ شوق عجیب لگے لیکن ذوق و شوق کے پیمانے ہر کسی کے اپنے ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص سخت گرمی اور سردی کا احساس کئے بغیر بڑے مزے سے دن بھر کھیلتا ہے دوسرا اس کو عجیب سمجھتا ہے، ایک بڑے شوق سے دودھ والی چائے پیتا ہے جبکہ دوسرا قہوے کا شوق رکھتا ہے، کوئی حیا کو پسند کرتا ہے تو کوئی فحاشی کو پسند کرتا ہے، کوئی شیروں اور درندوں کا شکار کرتا ہے، یا موٹر سائیکل اور گاڑی وغیرہ کا ریس مقابلہ کرتا ہے اور دوسرا اس کے عمل کو خودکشی کے مترادف سمجھ کر اس پر شدید تحفظات کا اظہار کرتا ہے۔

اسی طرح علماء پاکستان کے معاشی نظام میں سود کو حرام ٹھہراتے ہیں جو کہ ان کا ایک دینی فریضہ ہے، اب اگر کوئی اس کو تنگ نظری سے تعبیر کرے تو یہ ان کی غلطی ہے۔ نیز سود کے ہوتے ہوئے معیشت کا حال آپ کے سامنے ہے۔ اسٹیٹ بینک کی رپوٹ کے مطابق اس وقت پاکستان پر ٹوٹل قرض تقریباً اکتالیس ہزار ارب روپے ہے سودی نظام کے نقصانات کا مشاہدہ کر کے جاپان نے تو اس سے چھٹکارا حاصل کیا جبکہ کئی اور ممالک ہیں جو سودی نظام کے ختم کرنے کے درپے ہیں لیکن ہماری معیشت پر قابض لوگوں کو یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ علماء نے فقط سودی نظام کو حرام کہنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ غیر سودی نظام بھی پیش کیا ہے جو میزان بینک وغیرہ کی صورت میں منظم و اعلیٰ طریقے سے خدمات سرانجام دے رہا ہے جو کہ اب یورپ میں بہت عام ہو رہا ہے۔ چونکہ سود میں مجبور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے اس وجہ سے قرآن و حدیث میں سود پر بہت سخت وعیدات آئی ہیں حتی کہ سود خور سے اللہ تعالیٰ نے اعلان جنگ کیا ہے۔

اسی طرح علماء منشیات اور فحش فلموں سے منع کرتے ہیں منشیات کے استعمال کے نتائج بھی آپ کے سامنے ہیں اور حکومت بھی اس کے سد باب کے لیے کچھ کردار ادا کر رہی ہے ۔ جبکہ دنیا کے کئی سیکولر ملکوں میں بھی مختلف منشیات پر کلی طور پر یا جزوی طور پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں ۔ فحش فلموں کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں نوجوانوں کو کام سے نکالا، طلباء کی تعلیم کو کتنا متاثر کیا ۔ چین وغیرہ ملکوں کے کئی اعلیٰ عصری اداروں کے سربراہان اس بات پر مجبور ہوئے کہ انھوں نے اداروں میں موبائل فون پر پابندی لگادی جس کی ایک بڑی وجہ دوسری وجوہات کے علاوہ ایک یہ بھی ہے۔ اس طرح گھریلوں زندگیوں کو بھی بہت زیادہ متاثر کیاہے۔ یہ کہنا کہ ان سے دماغ کو سکون ملتاہے قطعاً غلط ہے اگر یہ بات درست ہوتی تو مغرب میں ٹینشن اور خودکشی کا تصور ہی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ حالانکہ وہاں فحاشی و عریانی کی مکمل آزادی کے باوجود خودکشیاں بھی بہت زیادہ ہیں۔ اگر فحاشی کرنے سے دماغ کو سکون ملتا تو چاہیئے تھا کہ سب سے زیادہ ٹینشن کے بیمار علماء ہوتے جو فحاشی کرنے کے بجائے اس کی روک تھام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود علماء میں ٹینشن کی بیماری نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ دین پر عمل کرنے کی وجہ سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ٹینشن و خودکشی غیر مسلم ممالک کی نسبت سے مسلم ممالک میں بہت ہی کم ہوتی ہے۔

علماء کرپشن کو درست نہیں قرار دیتے اور جو کسی کام کا اہل نہ ہو اس کو وہ کام سپرد کرنے کو خیانت سمجھتے ہیں، ذمہ داری پورا نہ کرنے کو خیانت سمجھتے ہیں، دھوکہ کو حرام سمجھتے ہیں، کفار کی غلامی سے منع کرتے ہیں اور اس کو اسلام اور ریاست کے لیے خطرناک قرار دیتے ہیں، دہشت گردی کو ریاست کے لیے کینسر سمجھتے ہیں۔

اسی طرح علمائے کرام وطنِ عزیز پر کسی کافر کی حکمرانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ایک ادارہ کا سربراہ وہ شخص بننا چاہیئے جو اس ادارہ کے متعلقہ فنون کے علم کے ساتھ ان سے متعلقہ امور میں مہارت بھی رکھتا ہو، جیسا کہ اسکول و ہسپتال وغیرہ کے نگران مقرر کرنے کے لیے اپنے کچھ اصول وضوابط طے ہوتے ہیں۔ جب ایک عام ادارہ کے لئے کچھ ضابطے ہیں تو کیا ایک اسلامی ملک کے نگران کے لئے کوئی ضابطہ نہ ہو گا؟ ایک کافر اسلامی ملک کو مسلمانوں کے دل کی آواز کے مطابق کیسے چلائے گا؟ وہ مسلمانوں وہ اتفاق و اتحاد کیسے پیدا کرے گا جو عالمِ کفر کے خلاف مسلمانوں کا ایک عظیم اسلحہ اور رعب کا سامان ہوتا ہے وغیرہ۔

اگر کسی کام کی تقرری کے لیے اشخاص میں مختلف صلاحیتیں ملحوظ رکھنا ضروری نہیں تو پھر ریاست مسجد کی امامت کے لیے بھی مدرسہ کا فارغ التحصیل ہونا لازمی قرار نہ دے بلکہ ذمی کو بھی مسجد کا امام بنائے۔ وزیر اعظم کے لیے مخصوص تعلیم حاصل کرنے کی شرط ختم کیا جائے تاکہ ہر شہری وزیر اعظم بن سکے۔ وغیرہ

ان تمام امور کو جب غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ یہی وہ امور ہیں جن کا خاتمہ ہی وطنِ عزیز کے تمام مشکلات اور مسائل کا حل ہے۔ اور علماء ہی وہ لوگ ہیں جو ان اسباب کو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں، پس جو طبقہ ملک کے مشکلات اور مسائل کے حل کرنے میں لگے ہوں ان کو تنگ نظر قرار دینا خود ہی تنگ نظری ہے۔

ایک سوال

کوئی ایک بھی ایسی چیز ثابت کر کے بتائیں جس کو اسلام نے منع کیا ہو اور وہ ریاست کے لیے مفید ہو؟ یا اس کو حکومت نے اختیار کیا ہو پھر اس کی وجہ سے ریاست نے ترقی کی ہو؟ یا کسی کام کے کرنے کے بارے میں اسلام نے کہا ہو اور وہ ترقی میں رکاوٹ ہو؟اس طرح کا معاملہ فقط وطنِ عزیز کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جتنے ملکوں نے مختلف حوالوں سے ترقی کی ہے اگر ان کی ترقی پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی ترقی کا راز ہی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا ہے اگر جاپان کی بنی ہوئی چیز کو پسند کیا جاتا ہے تو وہ اس کا معیاری اور دھوکہ سے پاک ہونے کی وجہ سے ہے حال یہ ہے کہ دھوکہ دہی سے اسلام نے منع کیا ہے۔ اگر کوئی ملک اسلحہ بنانے میں فائق ہے تو اس نے قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق عمل کیا ہے۔وانزلنا الحدید فیه باس شدید و منافع للناس- "اور ہم نے اتارالوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں" ۔جب اسلام پر جزوی طور پر عمل کی وجہ سے ممالک اتنی دنیاوی ترقی کرتے ہیں تو جب ایک ریاست بحیثیت ریاست شریعت کے تابع ہو جائے تو اسکی ترقی کا کیا حال ہو گا۔ خصوصاً وہ ملک جس کے اٹھانوے فیصد لوگ مسلمان ہوں اس طرح علماء ریاست پاکستان کا مملکتی مذہب اسلام قرار دینے پر خوش ہیں جس کا تذکرہ ہوا۔ جو لوگ پاکستان کو سیکولرازم ریاست بنانے کے در پے ہیں تو وہ اسلام کے حکومتی نظام میں کونسی کوتاہی دیکھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ سیکولرازم کے در پے ہیں خصوصاً جب ریاست عوام کا نام ہے اور عوام وطنِ عزیز کے مملکتی مذہب اسلام چاہتے ہیں ورنہ تقسیم ہند سے پہلے بھی سیکولرازم قائم تھا۔ تو پھر لاکھوں مسلمانوں کا جان کے نذرانہ پیش کرنے کا مقصد کیا تھا؟ہاں سیکولرازم میں شاید ان لوگوں کو فائدہ ہو جو

مفاد پرست ہوتے ہیں اور اسلامی نظام کے تحت وہ اپنے غیر فطری مفاد پورے نہیں کر سکتے ہیں، وہ کرپشن نہیں کر سکیں گے، شراب نہیں پی سکیں گے، چوری و بد نظری وغیرہ کے مواقع نہیں ملے گی وغیرہ ۔واللہ اعلم

فقط چند افراد کی وجہ پورے ادارے کو ہدف بنانا ناانصافی ہے

یہ ممکن ہے کہ کچھ علماء ایسی باتیں کرتے ہوں جو درست نہ ہوں لیکن فقط ان چند علماء کی وجہ سے تمام علماء کو تنگ نظر کہنا انصاف نہیں (خصوصاً جبکہ دوسرے علما بھی ان کی باتوں سے نالاں ہوتے ہیں)۔ جس طرح ایک درندہ صفت پولیس کی وجہ سے تمام پولیس ڈپارٹمنٹ کو درندہ کہنا یا ایک ظالم بد اخلاق ڈاکٹر کی وجہ سے تمام ڈاکٹروں کو ظالم و بد اخلاق قرار دینا یا ایک رکن اسمبلی کا دین سے جاہل ہونے کی وجہ سے پوری اسمبلی کو جاہل قرار دینا انصاف نہیں۔

دوسرا اشکال

﴿علماء ملک کی خدمت نہیں کرتے بلکہ مسجد و مدرسہ میں اپنے آپ کو محصور رکھتے ہیں﴾

جواب: ملک کی خدمت مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ کوئی عوام کا علاج کرتا ہے، کوئی عوام کی حفاظت کرتا ہے، کوئی عوام کو پڑھاتا ہے بلکہ جو بھی ملک میں کوئی کام کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں ملک کی خدمت کرتا ہوں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ میں وطن کا خادم ہوں، کرکٹر کہتا ہے کہ میں نے وطن کا نام بلند کیا اور دنیا میں پاکستان کا تعارف کرایا وغیرہ۔

اب ملک کے لیے علماء کی خدمات کو ایک لمحہ کے لئے دیکھتے ہیں۔ وطنِ عزیز کے عوام الحمد للہ اسلامی ذہنیت والے ہیں اور اسلامی ذہنیت رکھنے والا شخص اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے قرآن سیکھنا اور دینی تعلیمات سیکھنا ہر چیز پر مقدم سمجھتا ہے اور یہ کام

علماء کرام فیس کے بغیر یا انتہائی کم فیس پر انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ سر انجام دیتے ہیں۔ شاید کوئی محلہ ایسا ہو جس میں یہ سرگرمیاں موجود نہ ہوں۔ حالانکہ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اور عوام کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جو اپنی اولاد کو مکمل دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے دینی مسائل حل کریں اور ریاست کے تمام امور کا شریعت کی روشنی میں حل نکالیں، تاکہ ریاست اس پر چل پڑے جیسا کہ آئینِ پاکستان کا تقاضہ ہے۔ تو اس کے لئے بھی علماء کرام نے مدارس کا ایک مرتب نظام بنایا ہے جو لاکھوں کی تعداد میں طلبہ کو نہ صرف مفت تعلیم مہیا کرتے ہیں، بلکہ کتاب اور کھانا تک کے اخراجات اہلِ مدارس برداشت کرتے ہیں اور ایسے بہترین انداز میں تعلیم دیتے ہیں کہ دنیا بھر کے تشنگانِ علومِ نبوت کی نظریں پاکستانی مدارس پر ہیں۔ نیز تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے متعلقات سے بھی قوم کے بچوں کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ جن میں تحریر، خوشخطی اور مختلف زبانوں میں تقریریں سکھانا وغیرہ شامل ہے، یہاں تک کہ کئی مرتبہ ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ تقریری مقابلوں میں عصری طلبہ سے دینی طلبہ نے زیادہ نمبرات حاصل کئے ہیں۔

اسی طرح نماز باجماعت جو کہ واجب ہے علماء انتہائی کم وظیفہ پر پانچ وقت کی امامت پابندی کے ساتھ کراتے ہیں، عوام جس فقہی مسئلہ کو نہیں جانتے تو بغیر فیس کے مدلل انداز میں آسانی کے ساتھ مہر شدہ فتویٰ حاصل کرتے ہیں، بلکہ آن لائن دارالافتاؤں کا نظم موجود ہے جن کی وجہ سے ایک آدمی کو گھر بیٹھے اپنے درپیش مسئلہ کا حل مل سکتا ہے ۔ علمائے کرام زبان و قلم کے ذریعے لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں۔ باہمی تنازعات میں وہ ثالثی کا کردار ادا کرتے ہیں، نمازہ جنازہ وہ ادا کرتے ہیں، نکاح وہ پڑھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ریاست کی حفاظت کی خاطر ریاست کے منشاء کے مطابق جانوں کے نذرانے پیش کر کے

شہید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری عہدوں پر بھی خدمات پیش کرتے ہیں، کوئی اسکول میں استاد ہے اور کوئی یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہوتا ہے وغیرہ، کچھ حضرات ان میں سے تجارت کرتے ہیں، کچھ زمینداری کرتے ہیں تو کیا یہ ساری ریاست کی خدمات نہیں ؟ اگر ایک چپڑاسی کو ریاست کا خادم سمجھا جاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ قوم کے بچوں کو قرآن پڑھانے والا ریاست کا خادم نہیں ؟ دراصل علمائے کرام انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بناتے ہیں جو سب سے بڑھ کر عظیم کام ہے۔

لوگوں کے تاثرات مختلف ہوتے ہیں

اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو قرآن سیکھنے اور دین کے مسائل سمجھنے کو اہم نہیں سمجھتے ہیں تو ان کی وجہ سے علماء ریاست کے خادمین کی لسٹ سے نہیں نکلتے اگر اس طرح کے کچھ لوگوں کی بات کا اعتبار کیا جائے تو شاید کوئی بھی ایسا ادارہ نہیں ہو گا جس کو ریاست کے سب لوگ مفید سمجھتے ہوں۔ حتیٰ کہ پارلیمنٹ کو بھی کچھ لوگ فضول سمجھتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ پارلیمنٹ کو فضول کہنے والے ملک کے آئین سے باغی ہیں تو سوال یہ ہے کہ خادم قرآن کو فضول کہنے والا آئین کا وفادار ہے ؟ ان کچھ افراد کی نظر میں اہلِ مدارس کا جرم قرآن کی تعلیم عام کرنا ہے یا حکومت سے تنخواہ لئے بغیر خدمت کرنا ہے۔ یہ تو حکومتی ڈیوٹیاں احسن طریقہ سے سرانجام دے سکتے ہیں، با استعداد لوگ ہوتے ہیں، انہوں نے جو علم حاصل کیا وہ کوئی آسان کام نہیں اس کے لئے راتوں کو جاگنا پڑتا ہے لذتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ ان کی ایک بڑی تعداد کے پاس اسناد اور دوسری ڈگریاں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ اپنی مرضی سے دین و ریاست کی خدمت کرتے ہیں، ورنہ تجارت وغیرہ تو کر سکتے ہیں۔ لہذا اگر کچھ لوگ ان کو خدمتگار نہیں کہتے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں کیونکہ اس طرح ہوتا رہتا ہے۔

حکومت بھی کئی اداروں پر اس لئے بھاری رقوم خرچ کرتی ہے کہ یہ ریاست کے مفاد میں ہیں جبکہ عوام کی ایک کثیر تعداد ان اداروں کو مفید قرار دینا تو درکنار بلکہ ریاست کے لیے نقصان دہ سمجھتی ہے۔ مثلاً قومی کرکٹ کو لیجئے کہ عوام کی ایک کثیر تعداد اس کو وقت کی ضیاع سے تعبیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ تعلیم حاصل کرنے اور کام کرنے والوں کے لئے ایک ناسور ہے اور اس کی وجہ سے ان کی تعلیم و کام میں کافی خلل آتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ جس دن کرکٹ کھیلا جارہا ہو اس دن کھیل کے علاوہ دوسرے امور کے لئے گویا ان کے دل و دماغ مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ ریاست کے اہم عہدیداروں کے رویوں سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ اس کو وہ مفید نہیں سمجھتے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بڑی بھاری رقم ملنے کی امید کے باوجود قومی کرکٹ کا حصہ بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔

رہی یہ بات کہ علماء مسجد و مدرسہ کے اندر اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں، تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ مسجد و مدرسہ تو ان کی ذمہ داری ادا کرنے کی جگہیں ہیں جیسا کہ کوئی آفس میں پورا دن گزارتا ہے، کوئی بینک وغیرہ میں گزارتا ہے۔ البتہ چھٹیوں میں یا ضرورت کی بنا پر علماء وغیرہ سب معاشرہ میں خلط ملط ہوتے ہیں، شادی اور فوتگی وغیرہ کے مواقع پر حاضر ہوتے ہیں۔

قائد اعظم محمد علی جناح بھی علماء کی ان خدمات کے بہت معترف تھے۔ چنانچہ "تعمیر پاکستان اور علماء ربانی" صفحہ 129 " میں ہے 3 جون 1947ء کو تقسیمِ ہند کا اعلان ہو گیا تو 11 جون کو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ دیوبندی تحریک پاکستان کی کامیابی کی مبارک باد پیش کرنے کے لئے مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح کی کوٹھی پر پہنچے۔ جو نہی یہ حضرات ان کے کمرہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا، مصافحہ کے بعد اپنے پاس بٹھایا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے انہیں حصول پاکستان پر مبارک باد پیش کی تو انہوں نے کہا کہ "مولانا یہ مبارکباد تو آپ کو ہے کہ آپ ہی کی کوششوں سے یہ کامیابی ہوئی ہے"۔
(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی صفحہ 129)

پھر قیام پاکستان کے بعد پرچم کشائی کا موقع آیا تو قائد اعظم محمد علی جناح نے خود پرچم کشائی کے بجائے مغربی پاکستان میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور مشرقی پاکستان میں علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کو پرچم کشائی کا شرف بخشا۔ اس طرح اور کئی واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح علماء کرام کی خدمات کے انتہائی معترف و شکر گزار تھے۔ طوالت کی خوف سے ان واقعات کو چھوڑ دیا ہے۔

تیسرا اشکال

﴿مدارس سے فارغ التحصیل حضرات نہ تو ڈاکٹر ہوتے ہیں اور نہ ہی انجنیئر وغیرہ﴾

اس اشکال کے دو جوابات ہیں۔

پہلا جواب: مختلف اہداف کے پیشِ نظر مختلف ادارے بنائے جاتے ہیں، اور جب تک ایک ادارہ یا ایک شخص درست ہدف پر پورا اترتا ہے تو تنقید کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے مثلاً درزی اور زمیندار پر کوئی بھی یہ تنقید نہیں کرتا کہ اس جدید دور میں آپ یہ کام کرتے ہیں۔ اور ڈاکٹر کو نہیں کہ جاتا کہ دنیا چاند پر پہنچ گئی اور آپ زمین پر پھر رہے ہیں ۔اسی طرح مدارس کا ہدف یہ ہے کہ ان سے علماء کرام، فقہاء، مفسرینِ کرام اور محدثین نکلیں۔ مدارس اپنے اس ہدف میں نمایاں طور پر کامیاب ہیں حتیٰ کہ پوری دنیا سے بہترین علم کے حصول کے لیے تشنگانِ علومِ نبوت پاکستانی مدارس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تو اہلِ مدارس پر تنقید کے بجائے ان کے حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

دوسرا جواب : اگر مدارس سے ڈاکٹرز نکلنا شروع ہو جائیں تو وہ نہ مضبوط عالم ہوں گے اور نہ ہی قابل ڈاکٹر۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے کسی علم سے کسی قدر مناسبت کا پیدا ہونا اور ایک ہوتا ہے اس علم میں رسوخ و مضبوطی کا پیدا ہونا۔ کسی بھی علم میں مضبوطی پیدا کرنے کے لیے وہ امور درکار ہوتے ہیں جو صرف کسی قدر مناسبت پیدا کرنے کے لیے ضروری نہیں ہوتے، مثلاً مکمل فراغت، یکسوئی وغیرہ۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو قابل ڈاکٹر بننا چاہتا ہو تو وہ اس ادارہ میں جاتا ہے جہاں ڈاکٹرز بنتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس کے لیے فارغ و یکسو کرتا ہے بالآخر وہ فقط ڈاکٹر ہی بنتا ہے اگرچہ اس کو کئی دوسرے امور (تعمیرات وغیرہ) سے بھی قدرے مناسبت ہوتی ہے لیکن اس کی مہارت فقط ڈاکٹری میں ہوتی ہے اور بطورِ ڈاکٹر وہ لوگوں کا مرجع بن جاتا ہے۔ اور جن امور کے ساتھ اس کو قدرے مناسبت ہے تو اس میں وہ لوگوں کا مرجع و معتمد نہیں بنتا۔ اگر ایک طالب علم کہے کہ میں ڈاکٹر بھی بننا چاہتا ہوں، انجینئر بھی اور وکیل بھی، تو اس کو یوں ہی کہا جائے گا کہ بھائی ایک کام کو اپناؤ ورنہ اس شعر کے مصداق بن جاؤ گے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم   نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اس طرح کا معاملہ دینی علوم کا بھی ہے کہ اگر کوئی ان سے صرف مناسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو اہلِ علم کے ساتھ تعلق رکھنے، علماء کے بیانات سننے وغیرہ سے یہ مناسبت پیدا ہو سکتی ہے، جس کی بدولت اسے اپنے درپیش کچھ مسائل معلوم ہوں گے لیکن وہ قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط، جدید مسائل کا شرعی قواعد کی روشنی میں حل، قدیم مسائل میں عرف کی تبدیلی یا ضرورت پیش آنے کی وجہ سے تبدیلی، مسائل میں تطبیق وغیرہ جیسے اہم امور سے ناآشنا ہو گا۔ وہ لوگوں کا مرجع و معتمد بننا تو دور کی بات ہے، اس بے

چارے کو اپنے درپیش بہت سے مسائل میں علماء کرام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ خود اندازہ لگائیں کہ جب انسان کے اعضاء میں فقط ایک عضو کے علاج میں مکمل دسترس حاصل کرنے کے لیے مکمل یکسوئی و فراغت درکار ہوتی ہے تو شریعت کے علوم میں مہارت پیدا کرنا کیوں ضروری نہیں؟ اور ان پر دسترس حاصل کرنے کے لیے یکسوئی اور فراغت کیوں درکار نہیں ہوگی؟ کیا ایسے اداروں کا وجود ضروری نہیں جن میں شریعت کے احکامات پر دسترس حاصل ہو جائے؟ البتہ دینی علم سیکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف زبانیں ضمنی اوقات میں بھی سیکھی جاسکتی ہیں اور ساتھ ہی یہ علم پھیلانے میں معاون بھی ہیں اس لئے کئی مدارس میں یہ سکھائی جاتی ہیں، کہیں عصر کے بعد اور کہیں چھٹیوں میں سکھائی جاتی ہیں۔ اور کہیں اسباق شروع کرنے سے پہلے ایک سال یا دو سال مختلف زبانوں کے سیکھنے کے لیے مختص کر دیئے جاتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ مدارس کے نصاب میں کمی کر دی جائے تا کہ عصری علوم زیادہ شامل کئے جائیں تو یہ بات اس لئے قبول نہ کی جائے گی کہ اہلِ مدارس کا ہدف مخصوص نمبرات حاصل کر کے ڈگری حاصل کرنا نہیں بلکہ راسخین پیدا کرنا ہے اور اس صورت میں ہدف حاصل کرنا انتہائی مشکل ہو گا۔

چوتھا اشکال

﴿مدارس سخت ذہنیت بناتے ہیں جن سے متعلق افراد بالآخر دہشتگرد یا دہشتگردوں کے سہولت کار بنتے ہیں﴾۔

جواب: جواب سے پہلے دہشتگردی کی تعریف معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں پھر ان شاءاللہ جواب سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

دہشتگردی کی تعریف: درست معاہدہ و قانون کے خلاف پُر تشدد طریقہ سے ظلماً اپنے مفاد و مقاصد حاصل کرنے کو دہشتگردی کہتے ہیں۔ بعض حضرات دہشت گردی کی تعریف میں ''خوف و ہراس'' کے الفاظ شامل کرتے ہیں۔ لیکن یہاں اس لئے ذکر نہیں کئے کہ جب خلافِ قانون پُر تشدد طور پر اپنے مقاصد پورے کئے جاتے ہیں تو خود بخود عوام یا انتظامیہ میں خوف و ہراس پھیلتا ہے۔ لفظ'' معاہدہ و قانون'' سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلاف ورزی ذاتی نوعیت کی نہ ہو بلکہ انسانی حقوق سے متعلق ہو کیونکہ قانون سازی معاشرتی نظام ہی کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اس تعریف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عمومی طور پر دہشت گرد کچھ اثر ورسوخ رکھنے والے ہوتے ہیں اس لئے تو وہ خلاف معاہدہ و قانون اپنے مقاصد پورے کرسکتے ہیں ورنہ اثر ورسوخ نہ رکھنے والے لوگ پہلے تو اس طرح کی حرکات کا ارادہ تک نہیں کرسکتے۔ بالفرض اگر ارادہ کر بھی لیں تو پکڑے جاتے ہیں جس سے اکثر خوف وہراس کے بجائے اطمینان پھیلتا ہے۔ لفظ درست کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکومت یا ریاستی ادارے کے لوگ درست قانون کے خلاف کسی پر تشدد کرتے ہیں تو یہ حکومتی اور ریاستی دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ درست قانون کے خلاف ہونے کی وجہ سے عوام میں خوف وہراس پھیلتا ہے۔ اپنی مفاد و مقاصد سے مراد عام ہے خواہ وہ سیاسی ہو یا نظریاتی ہو اور یا مال کے حصول کے لیے ہو وغیرہ۔

بعض حضرات دہشت گردی کی تعریف میں لفظ "بار بار کرنا" لاتے ہیں جو کہ لفظ گردی سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہاں یہ لفظ اس لئے ذکر نہیں کیا کہ جو شخص پُر تشدد طور پر قانون شکنی کرتا ہے وہ اگرچہ پہلی مرتبہ ہو پھر بھی دہشت گردی ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ایک مرتبہ قانون شکنی کرنے والا عام طور پر سہولت کی وجہ سے بار بار قانون شکنی کا

ارتکاب کرتاہے اور معنی لغوی اور اصطلاحی میں اس قدر مناسبت کافی ہوتی ہے۔ بعض حضرات دہشت گردی کی تعریف میں ان الفاظ "منظم منصوبہ کے تحت" کا اضافہ کرتے ہیں ۔یعنی دہشت گرد جو واردات کرتے ہیں وہ منظم منصوبہ کے تحت کرتے ہیں۔ یہاں ان الفاظ کے بجائے "اپنے مفاد و مقاصد" کے الفاظ اس لئے لائے گئے تاکہ ان کے ذیل میں وہ واردات بھی آجائیں جو اچانک جذباتی طور پر (پہلے سے کوئی منصوبہ طے کئے بغیر) سامنے آئے کہ ان میں کسی مقصد کا حصول تو مقصود ہوتا ہے لیکن پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا کیونکہ اس نوعیت کی واردات دہشت گردی کے زمرہ میں آتی ہیں۔ لفظ "ظلماً" سے احتراز ہے "دفاعی" سے ۔لہذا اگر کوئی دفاعی طور پر کوئی واردات کرے تو اس کو بعض دفعہ اگرچہ قانون شکن و غیرہ قرار دیا جائے گا لیکن دہشت گرد نہیں۔ الفاظ "پُر تشدد طریقے سے" سے احتراز ہے مصالحت کے طور پر سے۔لہذا بطورِ مصالحت قانون شکنی کو خیانت کہا جائے گا۔ اگر اس میں پیسہ استعمال ہوا تو اسکو کرپشن، رشوت وغیرہ تو کہا جائے گا لیکن دہشت گردی نہیں۔

پھر یہ دہشت گردی کئی قسم پر ہے۔ اگر کوئی انفرادی طور پر کرتا ہے تو اس کو انفرادی دہشت گردی کہتے ہیں، اگر ایک جماعت کرتی ہے تو یہ جماعتی دہشت گردی ہے ،اگر ایک ریاست کرتی ہے تو یہ ریاستی دہشت گردی ہے۔ اور مذکورہ اقسام میں سے ہر قسم والی بڑی بھی ہوسکتی ہے، چھوٹی بھی ہوسکتی ہے۔ پھر اقسام کے اعتبار سے اس کے سدباب کے لیے مختلف قوانین بنانے پڑتے ہیں اور مختلف احکام کا اجراء کرنا پڑتا ہے۔

دہشت گرد کون؟

دہشت گردی کی اس تفصیل کے تناظر میں اگر علماء پر کھلے دل سے نظر دوڑایا جائے تو معلوم ہوگا کہ علماء کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اگر جہاد کے فضائل

و تعلیم دینے کی وجہ سے ان کو دہشت گرد کہا جاتا ہے پھر تو پاک فوج بھی دہشت گرد ہے کہ وہ فقط جہاد کی باتیں ہی نہیں بلکہ ان کا مشن ہی جہاد ہے بلکہ پوری ریاست دہشت گرد ہے کیونکہ اس کا آئین قرآن و حدیث کے اجراء کی بات کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن و حدیث تو جہاد کے فضائل و تعلیم سے بھرے پڑے ہیں۔ نیز علمائے کرام ہی وہ لوگ ہیں جو جہاد کے احکامات کو بیان کر کے دہشتگردی اور جہاد کا فرق واضح کر دیتے ہیں کہ جہاد میں دہشت گردی کی بو تک نہیں، جہاد میں دشمن کو پہلے اسلام کی دعوت دی جاتی ہے، اگر وہ اسلام لائے تو معاف ہے، اگر فدیہ قبول کرے تو معاف ہے، جہاد کے دوران بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر تعرض کرنا ممنوع ہے وغیرہ وغیرہ۔

اور اگر جہاد کے مقصد اور نتیجہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ جہاد دہشت گردی کی بیخ کنی کرنے والا ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے عالم کفر کے اس غلبہ کو پاش پاش کیا جاتا ہے جو غلبہ دہشت گردی کی بنیاد ہے، جسکا مشاہدہ ہم کرتے ہیں کہ جب سے عالم کفر کو غلبہ حاصل ہوا ہے اس وقت سے دنیا میں ریاستی طور پر منظم طریقہ سے دہشت گردی کا آغاز ہوا ہے۔ اور لفظ دہشت گردی کا استعمال بھی ایک فراڈ کی بنیاد پر اسی زمانہ سے انہوں نے ہی شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو کفر کے غلبہ اور دہشت گردی کے خاتمہ تک کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ۔ ”اور کفار سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب دین اللہ تعالیٰ کا ہو جائے“ پھر جب اسلام غالب آجائے اور کفار اسلامی مملکت کو تسلیم کر کے جزیہ ادا کرنے لگیں تو اسلام اسی غلبہ پر کفایت کرتا ہے اور کسی کو مسلمان بنانے پر مجبور نہیں کرتا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لا اکراہ فی الدین۔ ”دین میں کوئی جبر نہیں ہے“۔

لیکن اگر کفار غالب آگئے تو بدامنی، دہشت گردی اور ٹینشن میں اس لئے اضافہ ہو گا کہ عالمِ کفر فقط غلبہ پر کفایت نہیں کرتا بلکہ وہ مسلمانوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے اور راضی نہیں ہوتے جب تک وہ مسلمانوں کو کافر نہ بنائیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ غلبہ کے بعد بھی وہ مسلمانوں کو معاف نہیں کریں گے پھر وہ ریاستی دہشت گردی کریں گے۔ قرآن مجید میں ہے ولن ترضى عنك اليهود ولا النصرى حتى تتبع ملتهم ”یہود و نصاری تم سے ہر گز راضی نہیں ہونگے یہاں تک کہ تم ان کے دین کی تابعداری کرو“۔ موجودہ دور میں پوری دنیا دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ عالمِ کفر کو سپر پاور قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ فساد و دہشتگردی کفار و مشرکین کی سرشت میں داخل ہے اس لیے اسلام نے اس بڑے مرض (دہشت گردی) کو ختم کرنے کے لیے ابتدائی علاج یہ تجویز کیا ہے کہ کفار کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ یہ مرض جڑوں سے ختم کیا جائے اگر وہ اسلام نہیں لاتے تو دوسری تجویز یہ اختیار کی ہے کہ ان پر فدیہ مقرر کیا جائے تاکہ انکا ٹمپریچر کنٹرول ہو جائے اگر وہ فدیہ قبول نہیں کرتے تو پھر اس متعدی مرض کو کنٹرول کرنے کے لیے آپریشن ضروری قرار دیا جاتا ہے جو کہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

علمائے کرام تو اُنس و محبت رکھنے والے اور معاشرہ کے معتمد لوگ ہوتے ہیں، حقوق جاننے والے ہوتے ہیں، والدین کی قدر، اساتذہ کرام کی قدر، رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کی قدر اور ان کے حقوق ادا کرنے والے ہوتے ہیں، گالی، منشیات، ڈکیتی، کرپشن و غیرہ سے دور رہتے ہیں، یہ سب باتیں ہمارے مشاہدہ میں ہیں، ان کا دہشت گردی کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں۔ بعض لوگ عجیب ہوتے ہیں جب کہیں دہشت گردی کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس میں بیرونی قوتوں کا ہاتھ ہے اور جب ان کے سہولت کاروں

اور آپریٹروں کا سراغ لگایا جاتا ہے تو وہ کبھی سیاسی جماعت میں اثرو رسوخ رکھنے والے ہوتے ہیں کبھی کسی اور اوارے کے کوئی بندہ ہوتا ہے لیکن وہ لوگ پھر بھی خواہ مخوا علماء پر بدگمانی کرتے ہیں۔

ایک صاحب سے گفتگو

ایک صاحب نے بندہ سے کہا کہ مدارس سے دہشت گرد نکلتے ہیں میں نے کہا کس مدرسہ سے؟ انہوں نے کہا کہ فلاں شخص کو ریاست نے دہشت گرد قرار دیا حالانکہ آج سے پندرہ سال پہلے وہ فلاں مدرسہ میں درجہ ثانیہ پڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا اس کے علاوہ کوئی اور بتاؤ، وہ بتانے سے قاصر رہا۔ اب ذرا اس کے انصاف کو دیکھیں کہ ایک ایسے شخص کی وجہ سے تمام مدارس کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے جو پندرہ سال پہلے کسی مدرسہ میں فقط دوسرے درجے تک اسباق پڑھ چکا تھا۔ جس شخص کے بارے میں وہ بات کر رہا تھا، بندہ کو بھی میڈیا کے ذریعے سے اسکے کچھ حالات معلوم تھے۔ میں نے کہا کہ اسکولوں، کالجوں اور کمپنیوں سے بھی دہشت گرد نکلتے ہیں وہ حیرت سے بولا، وہ کیسے؟ میں نے کہا کہ جس شخص کے بارے میں تم بات کرتے ہو یہی شخص کسی وقت سکول، کالج اور کمپنی میں رہا ہے۔

بہر حال وہ صاحب یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک ہوتا ہے کسی ادارے کی سرگرمیاں اور ایک ہوتا ہے کسی وقت میں اس ادارہ سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کا عمل و کردار، ایک ہوتا ہے سکول و مدرسہ کی سرگرمیاں اور ایک ہوتا ہے کسی وقت میں ان سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کا عمل۔ فقط بعض افراد کے کردار کی وجہ سے اداروں کو ہدف بنانا درست نہیں بلکہ اداروں کی سرگرمیوں کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیسی ذہنیت بناتے ہیں یہی اصل ہے۔ (اور مدارس کیسی ذہنیت بناتے ہیں؟ اس کا کچھ تذکرہ ہو چکا اور کچھ آرہا ہے)

ورنہ اگر کسی کے عمل کی وجہ سے بالفرض اداروں کو موردِ الزام ٹھہرانا درست قرار دیا جائے تو پھر یہ کہنا بجاہو گا کہ تمام اداروں سے اچھے لوگ نہیں نکلتے۔

مثلاً وطنِ عزیز میں کرپشن کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تو کیا یہ کہنا درست ہے کہ عصری اداروں میں کرپشن کی تعلیم دی جارہی ہے ؟ اس کے علاوہ یہ بھی لازمی نہیں کہ ریاست جس کو دہشت گرد قرار دے وہ یقیناً دہشت گرد ہو گا۔ اس میں خطا کا امکان ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریاست کی پالیسی تبدیل ہو چکی ہو اور اس کو نئی پالیسی کے تناظر میں دہشت گرد قرار دیا گیا ہو لیکن ساتھ ہی تعصب و ظلم کا امکان بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ریاستی اداروں کے اہلکاروں نے کئی لوگوں کو دہشت گرد قرار دیکر مار دیا اور بعد میں ریاست نے خود مارنے والوں کو مجرم قرار دیا۔

دہشت گردی کے عوامل

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ دہشت گردی کوئی اتفاقی چیز نہیں بلکہ اس کے پیچھے مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں پھر ان عوامل کے بارے میں مختلف رائے پائی جاتی ہیں ایک یہ کہ غربت و بے روزگاری ہے کیونکہ جو بھوک اور غربت سے تنگ آکر اپنی زندگی ختم کر سکتا ہے اسے کسی اور کی جان لینے پر بھی اکسایا جا سکتا ہے اور ملک دشمن عناصر کے ہاتھوں کھلونا بنایا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس نظریہ کیساتھ اتفاق خصوصاً مسلمان ملکوں کے حوالے سے مشکل ہے کیونکہ اگر دہشت گردوں پر نظر دوڑائی جائے تو وہ مالدار لوگ ہی ہوتے ہیں جیسا کہ دہشت گردوں کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر دہشت گرد کچھ اثر و رسوخ والے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی اثر و رسوخ کی وجہ سے وہ اپنے مفاد حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ اگر قریب کے زمانہ میں ظاہر ہونے والے دہشت گردوں کو

دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ اسی نوعیت کے تھے کوئی پولیس کا آفیسر تھا، کوئی سیاستدانوں کے سر کا تاج تھا وغیرہ وغیرہ۔ غریب بے چارے کے اتنے مفادات و مقاصد اور تعلقات کہاں ہوتے ہیں۔ پھر اگر وہ خودکشی کرتا ہے تو وہ بہت بڑی ہچکچاہٹ کا شکار ہوتا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دوں گا۔ اس لئے وہ دوسروں کے قتل سے پرہیز کرتا ہے۔ اگر حقائق کو دیکھا جائے تو ابھی تک ایک رپورٹ بھی دیکھنے میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان نے اس لئے خودکش دھماکہ کیا ہو کہ وہ ویسے ہی خودکشی کررہا تھا بلکہ اکثر اس دھماکے کے اہداف کو بھی ہم میڈیا کے ذریعے سے سنتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی کی وجہ بھوک نہیں بلکہ اسکے پیچھے مخصوص اہداف کے لئے ایک خاص قسم کی ذہن سازی کارفرما ہوتی ہے، جس کے پیچھے "را" اور "موساد" کا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "را" اور "موساد" کے اپنے اہداف میں کامیابی کے لیے ملک کے بااثر اور ذمہ دار لوگوں کیساتھ روابط کا ہونا ضروری ہے ورنہ روابط کے بغیر "را" اور "موساد" کے اہلکاروں کو وطنِ عزیز میں چلنا پھرنا مشکل ہوتا ہے۔ دہشت گردی تو دور کے بات ہے بالفرض اگر دھماکہ کرنے والا فقیر ہی ہو تو بھی یہ فقیر تو بندوق کی مانند ہے اصل محرک اور ذمہ دار تو دوسرے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا عامل

دہشتگردی کا دوسرا عامل عصری تعلیم کا فقدان بتایا جاتا ہے۔ عصری تعلیم کی افادیت اپنی جگہ لیکن اس کو دہشت گردی کے لئے سدِباب قرار دینے میں کلام ہے کیونکہ جن لوگوں کو ریاستی اداروں نے دہشت گرد قرار دیا ہے ان میں ایک معتدبہ تعداد عصری تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی ہے۔ اسی طرح اگر دنیا پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ کئی

اعلیٰ تعلیم یافتہ ممالک ریاستی طور پر دہشت گردی میں ملوث ہیں ، ایک تعلیم یافتہ ملک دوسرے کو دہشت گرد قرار دیتاہے اور دوسرا پہلے کو دہشت گرد قرار دیتاہے ۔ تقریباً ایک صدی سے عصری تعلیم بڑی تیزی کیساتھ بڑھتی جارہی ہے اور ساتھ ہی دہشت گردی بھی بڑھتی جارہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیم دہشت گردی کے روک تھام کے لئے کافی نہیں جب تک اس کے ساتھ دینی تعلیمات نہ ہوں۔ مثلاً امریکہ ،روس و غیرہ طاغوتی طاقتوں کے سیاہ کارنامے ،مادی طاقت کے مظاہرے ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ ان نرے مادی علوم وفنون کے ارتقاء اور سائنسی انکشافات وایجادات کی فراوانی نے اس وقت دنیا کو کس خطرناک دوراہے بلکہ جہنم کے کنارے لا کھڑا کر دیاہے۔ روس نے امریکہ اور امریکہ نے روس کو تباہ کرنے اور جہنم بنا دینے کے لیے غیر معمولی تیاری کی گئی ہے۔ امریکہ روس کو بھی ہیر وشیما بنانے کے درپے ہے اور روس امریکہ کو ہیر و شیما بنانے کے درپے ہے، یہ ہے علومِ آخرت کی گرفت سے آزاد محض عقلی اور سائنسی علوم وفنون اور سائنسی ارتقاء کا کارنامہ۔

تیسرا عامل

ایک عامل یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بعض لوگ نادانی اور ناواقفیت کی بنا پر دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور ان کے آلہ کار بن جاتے لہٰذا اس کے لیے مختلف ادارے بنائے جائیں جن میں دہشت گردی کے متعلق امور کو جمع کرکے عوام تک پہنچایا جائے تاکہ اس آگاہی مہم کے وجہ سے عوام میں دہشت گردوں سے نفرت بیٹھ جائے اور وہ دہشت گردوں کے لیے آلہ کار نہیں بنیں گے جیسا کہ امریکہ ، اسرائیل و غیرہ میں مختلف ادارے بنائے گئے ہیں۔

ان اداروں کی افادیت کو اس حد تک تسلیم کرنے میں قباحت نہیں کہ شاید ایک ملک کے اندر ایک خاص قسم کی دہشت گردی ایک خاص حد تک کنٹرول کی جائے لیکن اس کے ذریعہ سے مطلقاً دہشت گردی کا خاتمہ ایک خواب ہو گا۔ حکومتیں کتنے امور کے بارے میں آگاہی مہم چلاتی ہیں لیکن لوگ پھر بھی ان امور میں پڑ جاتے ہیں ۔ جیسا کہ منشیات وغیرہ کے خلاف مختلف مہم چلانے کے باوجود ان کے استعمال میں کمی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ خود امریکہ کو دیکھیں کہ اس میں کئی قسم کی دہشت گردی عروج پر ہے اور بیرونی دنیامیں اسکی جانی دہشت گردی کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔

دہشت گردی کا محرک نفس پرستی ومفاد پرستی ہے

انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک عظیم کرشمہ ہے، ایک طرف تو اسے بڑی صلاحیتوں سے نوازاہے دوسری طرف اسے ضعیف بھی بنایاہے، اس کے مختلف مفادات و ضروریات ہوتے ہیں، مختلف مفادات کی خاطر انسان مختلف سرگرمیاں اپناتاہے، ہر مفاد کے حصول کے لیے اس کے مناسب طریقہ کار اختیار کرتاہے، اور جب اس کے مفاد پر زد پڑتاہے تو وہ کوئی بھی اقدام کرنے کے لیے تیار ہوتا حتی کہ انسان کے کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اگر ایک شرابی کو شراب نہ ملے یاایک غیر مسلم بھوکے کو کھانانہ ملے تو اس سے کسی بھی اقدام کی توقع ممکن ہے خواہ کسی سے مال چوری کرے یازبردستی لے لے۔ اور اگر کوئی ترتیب نہ بنی تو اس کو مروائے۔ اسی طرح شہوت کے غلبہ کی صورت میں میں انسانوں نے کیاکچھ نہیں کیا یہاں تک کہ اگر اس کو خودکشی ہی بہتر معلوم ہو تو اپنی اس خواہش کو پوراکرنے کے لیے وہ بھی کرڈالے گویاکہ خودکشی اس کے نفس کی ایک خواہش و چاہت بن کر اس کا مفاد بن جاتی ہے۔

بہر حال اگر دہشت گردی کے ایک ایک واقعے اور اس کے متعلقہ حقائق میں غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سارے واقعات نفس پرستی و مفاد پرستی پر ہی مبنی ہیں، کبھی معدنیات کے مفاد میں ہوتی ہے اور کبھی پانی و تیل کے مفاد میں، کبھی مال کی مفاد میں، کبھی عزت نفس کی بناء پر اور کبھی خواہشات نفس کی بناء پر ہوتی ہے جبکہ کبھی طاقت کے نشہ کی بناء پر کی جاتی ہے اور کبھی سپر پاور طاقتوں کے غلام اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے دہشت گردی کرتے ہیں۔ جیسا کہ امریکہ نے مختلف مفادات کی خاطر تقریباً بیس ملکوں پر بم برسائے اور اپنے دہشت گردی چھپانے کے لیے مختلف ملکوں پر مختلف لیبل چسپاں کر کے حملے کیے اور اپنی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہی ممالک اپنی پالیسیوں سمیت کرہ ارض پر اب بھی قائم ہیں لیکن اب ان کو دہشت گرد وغیرہ قرار نہیں دیا جاتا۔

دہشت گردی کا سدباب

پچھلے کئی دہائیوں سے دہشت گردی کے خاتمہ اور امن و امان کے قیام پر غور و فکر کرنے کے لیے دنیا بھر میں تقریباً سات ہزار تھنک ٹینک کے نام سے ادارے قائم ہیں۔ ان کے مشوروں کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اور بعض دفعہ ان کے مشوروں کی روشنی میں قانون سازی عمل میں لائی جاتی ہے اور کئی مصنفین نے اپنی کتاب کا موضوعِ سخن دہشت گردی بنا کر تحقیقات کیں لیکن ان کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ دنیا بھر میں دہشت گردی کے واقعات کم ہونے کے بجائے بڑھتے جارہے ہیں، بدامنی اور ٹینشن بڑھتا جارہا ہے سب سے زیادہ تھنک ٹینک امریکہ میں ہیں حالانکہ اس کو دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد سمجھا جاتا ہے اور اس کے داخلی امن و امان اور ٹینشن کی صورتِ حال انتہائی تشویشناک ہے لیکن یہ تو

میڈیا ہی کا جادو ہے کہ اس کی داخلی صورتِ حال کو اطمینان بخش ظاہر کرتا ہے اس طرح اس دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے آئے روز ملکی اور بین الاقوامی سطح پر قوانین بنائے جاتے ہیں اور پہلے سے بھی کافی قوانین موجود ہیں لیکن ان قوانین کے ہوتے ہوئے جزوی اور ریاستی طور پر دہشت گردی روز بروز بڑھتی جارہی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو شاید بے جانہ ہو گا کہ تھنک ٹینک کے بعض افراد اور بعض قانون دان جان بوجھ کر خود دہشت گرد ی کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔

اب یہ کہ دہشت گردی کا سدِّباب کیا ہے؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا اور اسلام کا غالب ہونا ہی دہشت گردی کا سدِّباب ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو یقین پیدا ہو گا کہ ان تعلیمات پر عمل کرنے کی وجہ سے ہی دہشت گردی و ٹینشن کا خاتمہ اور امن و امان قائم ہو گا، اسلامی تعلیمات پر عمل کی برکت تھی کہ دورِ جاہلیت کے اندھیرے روشنیوں میں بدل گئے، دشمنیاں دوستیوں میں بدلیں، مسلمان کو بھائی قرار دیا گیا، ذمی کی جان ومال کو محفوظ کیا گیا حتی کہ اس کے قتل پر قصاص لازم قرار دیا گیا۔ مثلاً اسلام کے معاشی نظام کو دیکھیں اسلام میں مالداروں پر زکوٰۃ، فطرانہ اور عشر واجب ہے اور مخصوص حالات میں مخصوص رشتہ داروں کی مالی امداد بھی واجب ہے، اس کے علاوہ نفلی صدقات کی ترغیب دی جاتی ہے اور خاص کر پڑوسیوں کیساتھ حسنِ سلوک کے بارے میں ہدایات آئی ہیں۔ الغرض ہر ایک کیساتھ درجہ بدرجہ حسنِ سلوک کی تعلیمات اسلام میں موجود ہیں حتی کہ جانوروں کے حقوق کے بارے میں باقاعدہ تفصیلات آئی ہیں یہاں تک کہ اسلامی ریاست میں اگر کتا بھوک کی وجہ سے مرتا ہے تو اس کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔ اب اندازہ لگائیں کہ اگر مال کے حوالہ سے اسلام کی تعلیمات

پر عمل کیا جائے تو کیا کوئی بھوکا رہے گا؟ ہر گز نہیں بلکہ شاید تمام کے تمام مالدار بن جائیں گے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ ریاست میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ پھر اس کی وجہ سے معاشرہ میں ایک گنا امن پیدا ہوگا، چوری وڈکیتی میں کمی آئے گی، ایک دوسرے کیساتھ خیر خواہی بڑھے گی، مالی ٹینشن اور کرایہ کے قتل میں کمی آئے گی وغیرہ۔

اسلام نے امن وامان قائم رکھنے کے لئے حدود و قصاص کا نظام قائم کیا ہے، اگر وطنِ عزیز میں صحیح معنوں میں حدود و قصاص کا نظام نافذ ہوا تو سالوں نہیں بلکہ مہینوں میں امن وامان کو نمایاں طور پر محسوس کیا جائے گا۔ آج اگر ایک ہی دن میں بیس، تیس ناجائز قتل ہوتے ہیں تو فقط چار، پانچ لوگوں کے سر قلم کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگ محفوظ ہوں گے، اسلام نے دشمنوں کے فتنہ وفساد کو ختم کرنے اور اسلام کے غلبہ تک جہاد کا حکم فرمایا ہے۔ اس طرح اسلام کے دوسرے احکامات کا حال ہے جن کو طول کے خوف سے ترک کر دیا۔ لیکن اگر تاریخ کو اٹھایا جائے تو معلوم ہو گا کہ جب تک مسلمان غالب تھے امن وامان تھا۔

ایک المیہ

ہم نے ایک عجیب فلسفہ اپنایا ہے، معلوم نہیں کہ جان بوجھ کر اپنایا ہے یا نا سمجھی سے اپنایا ہے۔ وہ یہ کہ ہم نے اسلامی اصولوں کے مطابق ذہن سازی وافراد سازی کو چھوڑ کر قانون سازی کو مسیحا سمجھا اور بڑے دھوم دھام سے قانون سازی کی بات کرتے ہیں۔ حالانکہ ضروری یہ ہے کہ جو ذہن قانون پر غور کرتا ہے، جو ہاتھ قانون لکھتا ہے، جس صاحب کی کرسی سے قانون کو نافذ کیا جاتا ہے اور جس صاحب کے ڈنڈے کے زور پر

قانون کا اجراء کیا جاتا ہے سب سے پہلے ان کی اصلاح کی جائے تا کہ ان کی فکروں کا زاویہ درست ہو اور قرآن و حدیث کی روشنی میں قانون سازی کریں۔ صاحبِ کرسی و ڈنڈا نہ تو بے جا کسی کو قانون میں پھنسائے اور نہ ہی اس پر اکھسانے والے سے رشوت لے کر قانون کا مذاق اڑائے۔ اسلام کے امن کا راز یہی ہے کہ وہ ذہن سازی اور قانون سازی دونوں کو ساتھ لے کر ماننے والوں کو چلاتا ہے مثلاً قتل کو دیکھیں جو کہ ہر معاشرہ میں انتہائی مذموم شمار کیا جاتا ہے قرآن میں ہے کہ جس نے مسلمان کو عمداً قتل کیا تو وہ اس کے بدلہ میں ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب و لعنت ہو گا۔ جب ایک مسلمان یہ وعید سنے تو وہ قتل سے باز آئے گا لیکن پھر بھی جس نے قتل کیا تو اس کی طرف قانون متوجہ ہو گا۔ قرآن مجید میں ہے یا یھا الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی ''اے ایمان والو تم پر قتل کی صورت میں قصاص واجب ہے''۔ پھر اسلام میں قانون کو نافذ کرنے والا حکمران ایک اعلیٰ دینی تعلیم یافتہ اور انتہائی متقی شخص ہوتا ہے وہ قانون کے اجراء میں رشتہ داری، ملامت، دباؤ و مفاد کو یکسر رد کرنے والا ہوتا ہے۔ تو جب وہ قاتل کو قتل کرے تو کتنے درندہ صفت لوگ اپنے قتل کے ارادوں سے باز آئیں گے اور کتنے لوگوں کی زندگیاں محفوظ رہیں گی۔ یہی بات قرآن مجید نے ان الفاظ میں آئی ہے۔ ولکم فی القصاص حیاۃ ''اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے''۔ اگر ذہن سازی نہ ہو تو عقل خواہشاتِ نفس کے گھوڑے پر سوار ہو کر ایسے قوانین بنائے گی جن کو دیکھ کر سلیم الفطرت لوگ حیران ہوں گے جیسا کہ مرد کا مرد کیساتھ نکاح کرنا وغیرہ۔ اور صاحبِ کرسی ان قوانین کا اجراء اس وقت کریں گے جب کہ ان کے مفاد میں ہوں، اگر مفاد میں نہ ہو تو قانون مفلوج ہو گا اور اگر یہ قانون ان کے مفاد کے خلاف ہو تو اس قانون

ہی کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم وطنِ عزیز میں بارہا اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ایک پارٹی برسرِ اقتدار آکر ایک قانون بناتی ہے دوسری پارٹی اس کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھ کر تبدیل کر دیتی ہے۔ حالانکہ کبھی وہ قانون درست اور مفید ہوتا ہے، اسی طرح صاحبِ ڈنڈا غیر مجرم کو مجرم قرار دے گا اور جب کوئی طاقتور قانون کو پامال کرے گا تو اس وقت وہ نابینا ہو گا اور دیوار میں لگے کیمرے کام چھوڑ دیں گے جسکا مشاہدہ بھی بارہا کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج قانون اور نظم وضبط کھلونا بن چکے ہیں اور یہ کھلونا بن کے رہیں گے۔ کیونکہ ہم نے رب العالمین، احکم الحاکمین کے احکامات کو پس پشت ڈالا ہے جو بہترین قانون اور بہترین نتائج کے ضامن ہیں۔

پھر لوگ انصاف نہ ملنے کی وجہ سے قانون ہاتھوں میں لیتے ہیں اور گویا ریاست کے اندر ریاست بن جاتی ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے تنازعات میں لوگ ریاست سے انصاف ملنے سے ناامید ہو کر باہم دست وگریباں ہو جاتے ہیں اور بالآخر قتل وغارت تک نوبت پہنچ جاتی ہے، پھر مقتول کے ورثا ریاست سے انصاف ملنے سے ناامیدی کی بنا پر خود ہی بدلہ لیتے ہیں اور چونکہ ورثا کی بھی ذہن سازی نہیں ہوئی ہوتی اس لیے وہ مقتول کے بدلہ میں قاتل اور اس کے مقتولین میں سے جس کو بھی ہو سکے قتل کر دیتے ہیں اگرچہ وہ بے گناہ بلکہ قاتل سے اس قتل کی وجہ سے سخت نفرت کرنے والا ہو، یا قاتل کے گھرانہ میں سے کسی ایسے شخص کو قتل کرتے ہیں جس کی وجہ سے قاتل کے گھرانے کو زیادہ صدمہ پہنچ جائے۔

دیکھیں! قانون موجود ہونے کے باوجود قتل پر قتل ہو رہا ہے۔ اور اس طرح سے مسلمانوں اور انسانیت کی کتنی بے حرمتی ہو گی کہ بس چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایک دوسرے

کو قتل کیا جائے گا گویا قتل تو گناہ ہے ہی نہیں البتہ مقتول کے ورثا کا بدلہ لینے کا ڈر موجود ہے، یہ سب کچھ ذہن سازی کے فقدان کی وجہ سے ہو گا۔

اسلامی تعلیمات پر عمل ہونے سے دہشت گردی کا خاتمہ کیسے نہیں ہو گا جو تعلیمات احکم الحاکمین نے ہی امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات کے لیے منتخب کیے ہیں، وہ ذات جس نے ہی تمام عاقلوں کو عقل دی تو کیا ان تھنک ٹینک والوں کی تعلیمات اللہ تعالیٰ کی تعلیمات سے اعلیٰ ہو سکتی ہیں ؟ ہر گز نہیں۔ ذرا کائنات پر نظر دوڑایئے جو ایک طویل عرصہ سے اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہوا ہے۔ کیا اس میں کوئی فتور ہے ؟ ہر گز نہیں۔ جبکہ تھنک ٹینک کے مشورے آئے روز بدلتے رہتے ہیں، ان مشوروں کی روشنی میں ایک قانون بنایا جاتا ہے پھر چند ہی روز بعد اس قانون کو اس لئے تبدیل یا ختم کیا جاتا ہے کہ یہ نقصان دہ ہے۔ ہماری عقلوں کی کوتاہی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم ایک ہی گاڑی میں ہر سال نئی نئی تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں اور چند سال پہلے کی گاڑی کو کوتاہ سمجھتے ہیں حالانکہ بناتے وقت اس پر بھی مکمل سوچ و غور کیا گیا تھا۔ اس طرح آج کی ایجادات کچھ عرصہ بعد ناقص تصور کی جائیں گی۔

مضبوط نظم وضبط چلانے کے لیے بھی تربیت یافتہ افراد کا وجود ناگزیر ہے

مضبوط نظم و ضبط بھی اچھے افراد کے بغیر مکمل نتائج نہیں دے سکتا، اگر چوری کی روک تھام کے لیے کیمرے لگائے جائیں اور اچھے افراد نہ ہوں تو جہاں کیمرہ نہ ہو یا کیمرہ خراب ہو وہاں چوری ہوں، اور کسی بڑی چوری کے لیے خواہ مخواہ کیمروں کو خراب کروایا جائے گا یا کسی دباؤ کی وجہ سے اس کی رپورٹ کو مٹایا جائے گا وغیرہ۔ یہ کیمرہ وغیرہ آلات تو انسان ہی کی ایجاد کردہ ہیں جن کے فائدے بھی ہوتے ہیں اور نقصانات بھی۔ اگر یہ تربیت

یافتہ افراد کے ہاتھوں میں چلے جائیں تو ان سے فوائد حاصل ہوں گے اور اگر غیر تربیت یافتہ افراد کے ہاتھوں میں چلے جائیں تو ان کا استعمال نقصانات اور ذاتی مفادات کے لیے ہو گا۔

نبی کریم ﷺ نے پہلے افراد سازی کی

اگر مکی اور مدنی دور پر نظر ڈالی جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکی دور میں افراد سازی ہی پر مکمل توجہ مرکوز رکھی گئی اور مدنی دور میں افراد سازی کے ساتھ ساتھ قانون سازی بھی کی گئی، کیونکہ اس وقت اتنے افراد تیار ہو چکے تھے جنہوں نے بہت احسن طریقہ سے مدینہ منورہ میں ریاست کے قوانین اور اجرا اور نظم و ضبط کنٹرول کر لیا اور پھر اس قانون سازی نے وہ نتائج دیے جن کا اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ جاہلیت کا دور قریب قریب گزرا تھا، اس ماحول کو سامنے رکھ کر قانون سازی اور اس کا اجرا، پھر اس سے بہترین نتائج کا حصول آسان کام نہ تھا لیکن یہ افراد سازی کے بعد آسانی سے حاصل ہوا ، قانون سازی کے اجرا میں جن دقتوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ بھی نہ پڑی اور قوانین و احکام کا عملی اجرا بھی ہوتا رہا۔

اس ذہن سازی اور افراد سازی کا نتیجہ دیکھنا ہے تو حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کا حیرت انگیز واقعہ دیکھیے کہ ان کے خلاف نہ تو شہادت دی گئی تھی اور نہ ہی گواہی پر جرح و تعدیل کی ضرورت پڑی بلکہ قانون اور حد کے اجرا کے لیے اپنے آپ کو بار بار پیش کیا حتی کہ قانون کا اجرا ان پر کیا گیا۔

تربیت شدہ افراد ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جب تک وہ غیر قانونی فعل کے ارتکاب کے بارے میں اپنے آپ کو پیش نہ کریں اس وقت تک وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہوئے سکون نہیں پاتے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی ریاست میں بھوک و پیاس سے ایک جانور کے مرنے پر بھی اپنے آپ کو مجرم ٹھہراتے تھے لیکن جب یہی قانون و ریاست حجاج بن یوسف کے ہاتھوں میں دیا گیا تو اس نے قانون کی آڑ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین جیسی پاکیزہ ہستیوں کو بھی بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کیا۔

وطنِ عزیز کے نقصانات کا ضامن کون؟

اگر پاکستان کے 72 سالہ تاریخ کو ایک اجمالی نظر سے دیکھا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ ریاست، ریاستی اداروں اور عوام کے جو بے شمار نقصانات ہوئے ہیں ان کا ضامن کون ہے؟ جس کی وجہ سے آج وطنِ عزیز گویا ایک آزاد ریاست کی حیثیت کھو چکی ہے۔ گویا ہماری داخلہ پالیسی FATF طے کرتی ہے۔ اور خارجہ پالیسی سعودی عرب اور معیشت کی پالیسی IMF طے کرتی ہے وغیرہ۔ یہ کوئی تجزیہ نہیں ہم روزانہ ایسی خبریں سنتے ہیں کہ بیرونی ممالک وطنِ عزیز میں اپنی مفاد کی پالیسیاں جاری کرتے ہیں۔ کیا وطنِ عزیز کا یہ حال علماء نے کیا؟ آج بے روزگاری کی وجہ سے لوگ خودکشیاں کرتے ہیں اور ریاست کے پاس کام کے مواقع نہیں ہیں۔ عصری اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات مجبوراً باہر ملکوں میں سفر کی زندگی گزار کر حلال کسب کرتے ہیں۔ یہ تو علماء کا اس ملک پر احسان ہے کہ ان کی بھاری اکثریت سرکاری ملازمین نہیں ورنہ خودکشیوں میں اور اضافہ ہوتا کیونکہ پھر کام کے مواقع اور بھی کم ہوتے، آج تو دس پوسٹوں پر تقریباً دو ہزار لوگ داخلے کی درخواست دیتے ہیں اگر علماء بھی ہوتے تو پھر شاید درخواست دہندگان کی تعداد پچیس سو ہوتی۔ اسی طرح وطنِ عزیز میں دوسرے مختلف قسم کے جرائم ہوتے رہتے ہیں مثلاً ٹارگٹ کلنگ، ڈکیتی، کرپشن، منشیات کا استعمال و کاروبار، سٹہ بازی اور سود وغیرہ۔ تو

ان جرائم میں شاید ہی کسی عالم کا نام نکل آئے بلکہ یہ امور علماء کے علاوہ افراد کرتے ہیں ۔لیکن حکومت یہ ظلم کرتی ہے کہ دباؤ کے تحت مدارس کو بدنام کرتی ہے اور طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتی ہے، کبھی کہتے ہیں کہ مدارس کی اصلاحات کرتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ انکو قومی دھارے میں لاتے ہیں وغیرہ۔بنک اکاؤنٹ کھولنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے ،رجسٹریشن میں طرح طرح کے شرائط لگاتی ہے۔ حتی کہ عوام کے لیے مدارس میں زکوۃ و صدقات دینے میں بھی رکاوٹ بنتی ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ مدارس والے چمڑے اس لئے جمع نہیں کرینگے کہ ان پر جنگ و جدال کی نوبت آتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پورے ملک میں فقط چار، پانچ ایسے جھگڑوں کے لیے قانون سازی کی جاتی ہے جو یقینی نہیں بلکہ ان کے واقع ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ حالانکہ قانون سازی تو شاذ و نادر چیز کے لیے نہیں کی جاتی بلکہ کثرت سے وقوع ہونے والے امور کے لیے کی جاتی ہے۔ پھر قانون سازی بھی عجیب ہے کہ چمڑوں کے جمع کرنے کو منع کیا گیا حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ فقط جنگ و جدال کرنے والوں کے خلاف قانون سازی کی جاتی، اگر لوگ ٹریفک کے اصولوں کا خیال نہیں رکھتے تو ٹریفک کو بند کیا جانا چاہیے یا خلاف کرنے والوں کو قانون کے شکنجے میں لایا جانا چاہیئے؟

اسی طرح کبھی کہا جاتا ہے کہ اہلِ مدارس وغیرہ اس قانون کا استعمال غلط کرتے ہیں اسلئے یہ قانون ختم ہونا چاہیئے۔ حالانکہ جب قانون درست اور مفید ہو تو اس کا یہ حل نہیں کہ اس قانون کو ختم کردیا جائے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مقدمہ درج کرنے کا طریقہ کار ہی ایسا اختیار کیا جائے جس سے یہ شبہ ہی نہ رہے کہ اس قانون کا استعمال غلط ہوا ہے، حکومت از خود قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف ایکشن لے اور اس

کو قانون کے کٹہرے میں لائے۔ اگر غلط استعمال کی وجہ سے قوانین کو ختم کرنا شروع کیا جائے تو پاکستان کے تقریباً تمام قوانین ختم کرنے پڑیں گے اور ہر چیز کے لیے از سر نوئے قوانین بنانے پڑیں گے۔

اسی طرح حکومت کہتی ہے کہ مدارس ہر سال آڈٹ رپورٹ جمع کرائیں گے حالانکہ ریاست کے جتنے ادارے ایسے ہیں جن کے اخراجات حکومت برداشت نہیں کرتی حکومت ان سے آڈٹ رپورٹ طلب نہیں کرتی صرف مدارس ہی ہیں جن کے لئے مختلف قسم کی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔

پانچواں اشکال

﴿اتنے زیادہ مدارس کی کیا ضرورت ہے؟﴾

جواب: قیاس کا تقاضہ اور ساتھ ہی مشاہدہ یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اس کے فراہم ہونے کی جگہیں زیادہ ہونی چاہیئے اور زیادہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام بھی وسیع پیمانے پر کیا ہوا ہے اور تیل کی ضرورت پانی کی طرح نہیں اسلئے اس کا انتظام بھی محدود طور پر کیا ہوا ہے، یا جیسا کہ سبزی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اس کے فروخت کی جگہیں بھی زیادہ ہوتی ہیں جبکہ سبزی کی نسبت گاڑیوں کی خرید و فروخت کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی اسلئے اس کی دکانیں بھی کم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مسلمان ہر لحظہ دین کی رہنمائی کے محتاج ہوتے ہیں وہ اپنی عبادات میں، معاملات میں، معاشرت میں، اخلاقیات وعقائد وغیرہ میں علماء کی رہنمائی کے محتاج ہوتے ہیں تو مدارس کے بڑھانے کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، دارالافتاؤں میں روزانہ کے حساب سے کافی استفتاء حل کیے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود استفتاؤں کا انبار ختم نہیں ہوتا۔

خدمات کا موازنہ

اگر ریاست کے لئے علماء اور دوسرے سرکاری ملازمین کی خدمات کا موازنہ کیا جائے تو واضح فرق محسوس ہو گا۔

یہاں علماء اور ڈاکٹروں کی خدمات کو ایک لحظہ کے لئے دیکھتے ہیں (ڈاکٹر کو موازنہ کے لئے اس لئے منتخب کیا کہ تقریباً ہر شخص کا اس سے واسطہ پڑتا ہے تو یہ جلد سمجھ میں آجائے گا۔) ڈاکٹر صاحب حکومت سے خاطر خواہ تنخواہ کے ساتھ ساتھ مخصوص مراعات لیتا ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد موت تک بلکہ موت کے بعد اس کی بیوی اور غیر شادی شدہ اولاد کو پینشن ملتی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ علاج بھی کرتا ہے تو پھر یہ فقط دو، تین منٹ کی تشخیص پر آٹھ سو، ہزار، پندرہ سو کم و بیش تک فیس لیتا ہے۔ اگر اس نے اس دو، تین منٹ میں بیماری اور اسکے عوامل معلوم کئے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر اس کے لیے ایکسرے اور ٹیسٹ وغیرہ کرنے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے یہ تشخیص دو، تین ہزار سے دس ہزار کم و بیش تک پہنچ جاتی ہے۔ (اور ایکسرے وغیرہ کے ذریعے سے تشخیص کوئی شاذ و نادر نہیں ہوتی بلکہ تقریباً اسی، نوے فیصد لوگوں کی تشخیص اس طرح کی جاتی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر حضرات بیماری کی تشخیص اپنے تجربہ سے کیوں نہیں کرتے؟ کیا وہ اپنے آپ کو تشخیص کا اہل نہیں سمجھتے یا اپنی تشخیص پر اعتماد نہیں اور مشینریوں پر اعتماد ہے یا ایکسروں وغیرہ کے ذریعہ سے مریضوں کا اعصابی علاج کرتے ہیں یا اور کوئی وجہ ہے؟) پھر اگر آپریشن کی ضرورت پڑے تو تقریباً ایک آپریشن پر ہزاروں لاکھوں رقم وصول کرتے ہیں۔ اب علماء کی خدمت کو دیکھتے ہیں علماء کی تدریس کا وظیفہ عام طور پر اتنا ہوتا ہے جو مال کے لحاظ سے ایک متوسط حیثیت آدمی کی جیب کا خرچ ہوتا ہے۔ (اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ مہتممین حضرات اہلِ خیر حضرات کے زکوٰۃ وصدقات میں کتنا احتیاط کرتے ہیں) امامت کی تنخواہ تو عام طور پر اس سے بھی کم ہوتی ہے۔اسی طرح اگر کوئی مشکل ترین اور پیچیدہ مسئلہ دارالافتاء بھیج دیا جائے تو اس پر مفتیان کی ایک جماعت کبھی پورا ہفتہ بلکہ مہینہ تک تحقیق کرتی ہے پھر سائل کو تفصیلی جواب مع دستخط و مہر کے کوئی فیس لئے بغیر دے دیتے ہیں، اگر راستہ میں ان سے مسئلہ پوچھا جائے تو راستہ میں ہی جواب دیتے ہیں یا مسجد یا حجرہ میں پوچھا جائے تو اسی جگہ پر سائل کی مشکل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ تنخواہوں میں اضافے کے لیے آواز اگر اٹھتی ہے تو وہ سرکاری اداروں ہی کے لوگ ہوتے ہیں جس سے ان حضرات کی مملکت و ریاست کے ساتھ وفاداری پر حرف آتا ہے کیونکہ وطنِ عزیز پہلے ہی قرضوں کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس طرح کی آواز اہلِ مدارس سے کبھی نہیں سنی گئی۔

چھٹا اشکال

﴿اہلِ مدارس کو مکمل عربی نہیں آتی﴾

جواب: ایک ہوتا ہے کوئی علم و فن سیکھنا اور ایک ہوتا ہے زبان سیکھنا، دونوں جدا جدا چیزیں ہیں۔ کبھی ایک شخص کو ایک زبان تو آئیگی مگر وہ اس زبان میں کسی علم و فن کو نہیں جانے گا اور کبھی اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے کتنے لوگ ہیں جن کے ساتھ مختلف علوم و فنون کی ڈگریاں ہیں اور وہ واقعی اپنے متعلقہ فن میں قابل ہوتے ہیں مگر ان کو انگریزی بول چال پر عبور حاصل نہیں ہوتا حالانکہ وہی فنون انگریزی میں ہونگے۔ اگر زبان و فن لازم وملزوم ہو تو انگلش لینگویج سنٹر سے ڈاکٹر، انجنیئر وغیرہ نکلنے چاہیئے تھے۔ بس اس طرح کا معاملہ دینی علوم سیکھنے اور عربی میں تکلم کا ہے۔

ساتواں اشکال

﴿ مولویوں کا کام ہی فتوی بازی ہے ہر ایجاد کے خلاف فتوی دیتے ہیں اور پھر وقت گزرنے کیساتھ اس چیز کو خود استعمال کرنے لگتے ہیں مثلاً لاؤڈ سپیکر کے خلاف تھے اور اب سب سے زیادہ مولوی استعمال کرتے ہیں﴾۔

جواب: اس اشکال کے کئی حصے ہیں جس کی وجہ سے اس کے کئی جوابات ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مولویوں کا کام فقط فتوی بازی نہیں بلکہ ان کا اور دیگر تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ دین کی حفاظت کریں، اشاعت کریں اور اسلام کے غلبہ کی کوشش کریں البتہ عوام دینی امور میں رہنمائی اور فتویٰ علماء ہی سے حاصل کریں۔ اور علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں فتوی جیسا اہم فریضہ سرانجام دیا کریں خصوصاً جدید مسائل کا حل تلاش کرکے امت کی رہنمائی کریں جس طرح مرض میں ڈاکٹر اور مقدمہ میں وکیل سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ اور علماء کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ غیر شرعی امور کی نشان دہی کرکے مسلمان بھائیوں کو ان سے بچنے کی ترغیب دیں خواہ وہ غیر شرعی امر تجارت سے متعلق ہو یا حکومت کے قانون سے متعلق ہو یا کسی ریاستی ادارہ کے افعال سے متعلق ہو۔

اس اشکال کا دوسرا جز یہ ہے کہ مولوی ہر ایجاد کے خلاف فتوی لگاتے ہیں۔ اس کی کچھ وضاحت یہ ہے کہ ایک ہے کسی چیز کا نفسِ ایجاد اور اس کی مطلقاً افادیت یا نقصان کے بارے میں بات کرنا اور ایک ہے اس ایجاد کردہ چیز کے مختلف استعمالات پر بات کرنا۔ یہ دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ مثلاً اسی لاؤڈ سپیکر کو لیجئے کہ ایک اس کے ایجاد کے فوائد ہیں اور ایک اس کے استعمال کے مختلف طریقے ہیں کہ جلسہ و جلوس میں اس کے ذریعہ سے آواز پہنچانا اس پر آذان دینا و امامت کرنا وغیرہ۔

علماء کا اختلاف اس کے ایجاد کے درست ہونے، نہ ہونے، فائدہ دینے نہ دینے میں نہیں تھا، بلکہ اس کے ایجاد کے درست اور نفع بخش ہونے پر تو علماء کا اتفاق تھا لیکن ان کا اختلاف اس کے بعض استعمالات میں تھا کہ اس کا یوں استعمال درست ہے یا نہیں؟ مثلاً بعض علماء کہتے تھے کہ اس سے نماز ادا کرنا درست ہے اور بعض کہتے تھے کہ درست نہیں۔ اس طرح بعض دوسری ایجادات میں علماء کا اختلاف فقط بعض استعمالات میں ہوتا ہے مطلقاً ایجادات میں نہیں ہوتا مثلاً ٹی وی، موبائل وغیرہ۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ علماء ہر ایجاد میں اختلاف کرتے ہیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ آئے روز نئی نئی ایجادات ہوتی ہیں لیکن علماء تو سینکڑوں میں سے ایک، دو ہی کے بعض استعمالات میں اختلاف کرتے ہیں۔

اس اشکال کا تیسرا جزیہ ہے کہ پھر یہی علماء خود اس چیز کو استعمال کرنے لگتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ یہی علماء اس ایجاد کردہ چیز کا استعمال کرتے ہیں لیکن اس حیثیت سے نہیں کرتے جس حیثیت سے وہ اس کے استعمال کو ممنوع قرار دیتے تھے۔ اگر ذرا گردونواح میں دیکھیں تو اب بھی علماء ٹی وی اور موبائل پر فحش فلم تو دور کی بات ہے فضولیات بھی نہیں دیکھتے البتہ بعض امور میں ضرورت پیش آنے، عموم بلوی یا عرف وغیرہ کی وجہ سے تبدیلی ہوسکتی ہے یہ امور بھی شریعت ہی کے احکامات میں سے ہیں جن کے اپنے مواقع واحکام ہیں جنہیں مضبوط علم والے ہی جانتے ہیں۔ باقی ان معترضین کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ اگر وہ ناجائز ہونے کا قول ذکر کر کے غلط انداز میں سب علماء کی طرف منسوب کرتے ہیں تو وہ جواز کے قول کرنے والے علماء کا تذکرہ بھی کیا کریں حالانکہ ان کی تعداد زیادہ بھی ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تحقیقات اذواق کی روشنی میں سرانجام دیے جاتے ہیں اور اذواق میں فرق ایک بدیہی امر ہے لہٰذا تحقیقات اختلافات کا رونما ہونا ایک فطری بات ہے

جس کو ہم روزانہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک چیز سے متعلق مختلف سائنسی تحقیقاتی اداروں کی تحقیقات میں کافی فرق ہوتا ہے۔ طبی تحقیقاتی اداروں کی ایک چیز کے خواص و آثار کی رپورٹ میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔اور ہر چیز کے لیے کچھ نہ کچھ ایسے خواص بیان کرتے ہیں جو بہتر نہ ہوں اور خواص پڑھنے والے کو تردد میں ڈالتے ہے،اسی طرح ایک ادارہ کوئی تحقیق کرتا ہے پھر مستقبل میں غلط ثابت ہونے کی وجہ سے رجوع کرتا ہے، اس طرح کئی تھنک ٹینکز کے کافی غور و فکر کے بعد ایک قانون بنایا جاتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد اس کو نقصان دہ قرار دے کر بدلا جاتا ہے جس کی وجہ سے کافی لوگ متاثر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ تو اس صورت حال میں فقط علماء ہی کو تنقید کا نشانہ بنانا کہاں کا انصاف ہے۔

اداروں کا موازنہ

اگر کسی ملک کو ایک منظم و ترقی یافتہ ریاست تصور کیا جاتا ہے تو ذہن خود بخود ریاستی اداروں کی طرف جاتا ہے، کیونکہ ریاستوں کی بقاو مضبوطی اداروں کی بقاو مضبوطی پر موقوف ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ وطنِ عزیز کے عصری تعلیمی اداروں و دینی تعلیمی اداروں میں کن کی کارکردگی اعلیٰ ہے؟ چونکہ دونوں قسم کے اداروں کے نصاب و اہداف وغیرہ میں کافی فرق ہے جس میں موازنہ کرنا مشکل ہے اس لیے دونوں قسم کے اداروں کو اپنی نوعیت کے بین الاقوامی اداروں کے تناظر سے دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ سے ایک حد تک ان کے درمیان موازنہ کرنا آسان ہوگا۔ دنیا کے مشہور ترین چند عصری اداروں میں پاکستان کا ایک ادارہ بھی شامل نہیں حالانکہ پاکستان میں عصری ادارے بہت زیادہ ہیں، حکومتوں کا بھرپور تعاون ان کو حاصل ہے اور عوام کا رجحان بھی اُس طرف کافی زیادہ ہے۔ ایک پاکستانی جب اعلیٰ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو وہ دوسرے ملکوں سے ڈگریاں حاصل

کرنے جاتا ہے اور ان ڈگریوں کی وجہ سے یہاں معتمد بن جاتا ہے یعنی عوام بھی پاکستانی ڈگریوں پر اتنا اعتماد نہیں کرتے جتنا دوسرے ملکوں کی ڈگریوں پر کرتے ہیں اس طرح دیگر اداروں کی حالت ہے البتہ سیکورٹی اداروں پر تعلیم کے اعتبار سے نہیں بلکہ ٹریننگ کے اعتبار سے کچھ اعتماد کیا جاتا ہے ،اگرچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمارے سیکورٹی اہلکار بھی باہر جاتے ہیں۔ اب دینی مدارس کو دیکھیں کہ الحمدللہ عالمی سطح پر پاکستان کے دینی مدارس کو مرکزیت کی حیثیت حاصل ہے اور دنیا بھر میں جو اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ پاکستان کے مدارس کا رخ کرتا ہے اب بھی وطنِ عزیز میں کئی ملکوں کے طلبہ مدارس میں زیرِ تعلیم ہیں۔

کیا مدارس میں اصلاحات کی ضرورت ہے؟

کسی ادارہ میں اصلاحات کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب وہ دیئے گئے اہداف پر پورا نہیں اترتا۔ اگر ایک ادارہ اپنے اہداف پورا کرتا ہے تو اس میں اصلاحات کی ضرورت پیش نہیں آتی البتہ اس کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جو کوتاہی کی صورت میں فوراً اس کوتاہی کا ازالہ کرے اور ادارہ کی ترقی کی کوشش میں لگی رہے ۔اب یہ دیکھتے ہیں کہ مدارس کا ہدف کیا ہے؟ مدارس کا ہدف بہترین علماء و محدثین وغیرہ پیدا کرنا ہے اور مدارس اس ہدف کو بہترین انداز میں پورا کر رہے ہیں علماء، مدرسین، مفتیانِ کرام، محدثینِ عظام، فقہاء اور مفسرین پیدا کر رہے ہیں۔ اور ان کی نگرانی کے لیے ملک کے نامور علماء کرام کی کمیٹی بھی موجود ہے۔ بالفرض اگر مدارس میں اصلاحات کی ضرورت ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ اصلاحات کون کرے؟ اگر ایک اسکول و ہسپتال میں اصلاحات و نگرانی کے لیے اعلیٰ عصری تعلیم یافتہ ہیڈ ماسٹر و قابل ڈاکٹر کا انتخاب ضروری

قرار دیا جاتا ہے تو مدارس کی اصلاحات و نگرانی ان لوگوں کے حوالہ کرنا جن کو نماز کے واضح مسائل تک کا علم نہیں ہوتا ہے سراسر ناانصافی ہے اور اس کا نتیجہ مدارس کے ویران ہونے کی صورت میں ہی سامنے آئے گا۔

کیا عصری اداروں میں اصلاحات کی ضرورت ہے؟

تقسیمِ ہند سے پہلے مسلمان قومی دھارے میں شامل تھے لیکن وہ ایک مکمل اسلامی ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان کی جدوجہد ہی کا نتیجہ تھا جو وطنِ عزیز پاکستان کی صورت میں ہمیں ملا۔ تو ایک مسلمان کے لیے خصوصاً اس خطہ کے مسلمان کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے دینی مفاد کو مقدم رکھے پھر قومی مفاد کو حاصل کرے۔ اب یہ فیصلہ قارئین نے ہی کرنا ہے کہ ہمارے عصری تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے طلبہ کس حد تک دین سے واقف ہوتے ہیں؟ بالفرض اگر ان طلبہ کو فقط ان ہی اداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے تو کیا وہ دین کو اس قدر سمجھ سکتے ہیں جو دوسروں کی رہنمائی کر سکیں یا کم از کم خود ان کے لئے نجات کا ذریعہ بنیں کیا ان کو نماز، روزہ، حج، تجارت مضاربت وغیرہ کے ضروری احکام معلوم ہو سکتے ہیں؟ ان کو مختلف حقوق معلوم ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ معلوم نہیں ہو سکتے کیونکہ نصاب میں یہ امور شامل ہی نہیں۔ تو کیا ان اداروں کے نصاب میں اصلاحات کی ضرورت نہیں؟

یکساں نظامِ تعلیم

﴿بعض حضرات یہ اشکال کرتے ہیں کہ اہلِ مدارس یکساں نظامِ تعلیم سے کتراتے ہیں﴾

جواب: اس کی کچھ وضاحت یہ ہے کہ پاکستان میں آٹھویں جماعت تک چار قسم کے نصاب پڑھائے جاتے ہیں وفاقی اسکولوں کا اپنا نصاب ہوتا ہے اور دیگر سرکاری اسکولوں کا الگ، پرائیویٹ اسکولوں کا الگ الگ اور مدارس کا نصاب الگ ہوتا ہے۔ چونکہ اکثر پرائیویٹ

اسکولوں کے مالکان بھاری فیسیں لیتے ہیں اس وجہ سے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سرکاری اسکولوں اور ان کے اسکولوں کی پڑھائی میں نمایاں فرق ہو تاکہ عوام کی فیس ضائع نہ ہو اور عوام کا ان پر اعتماد ہو اس لئے وہ دوسرے اقدامات کیساتھ ساتھ اعلیٰ نصاب کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔ چونکہ ان نصابوں میں کافی فرق ہوتا ہے اور غیر سرکاری اسکولوں کا نصاب معیاری ہوتا ہے جس کی وجہ سے سرکاری اسکولوں کے طلبہ اور ان کے والدین احساس کمتری کے شکار ہوتے ہیں اس لئے حکومت نے ایک ہی قوم میں اس اہم شعبہ میں یہ فرق مناسب نہیں سمجھا اور ان نصابوں کو قریب لانے کے لیے یکساں نظامِ تعلیم کا بِل پاس کیا۔ اس بِل کی وجہ سے شاید نصاب میں زیادہ نمایاں فرق ختم ہو جائے لیکن مکمل ایک جیسا ہونا ناممکن ہے کیونکہ بعض صوبوں کے نصاب میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے اور بعض میں نہیں و غیرہ ۔ اسکولوں کے لیے تو یہ بل اب پاس ہوا جبکہ اہلِ مدارس کیساتھ اسی طرح کا معاہدہ تقریباً تیس سال پہلے طے پایا تھا۔ اسی معاہدہ ہی کے تحت جب ایک طالب علم درجہ ثانیہ کے وفاق المدارس کا امتحان دیتا ہے تو اس کے پاس آٹھویں جماعت کی سرٹیفکیٹ ہونی ضروری ہے اور اگر اہلِ مدارس خود اپنے مدارس کے اندر عصری تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے ہیں تو پھر ان پر لازمی ہے کہ وہ فلاں فلاں کتاب نصاب میں شامل کریں اور اہلِ مدارس نے معاہدہ کے تحت طے شدہ کتابیں درجہ متوسطہ کے نصاب میں شامل کی ہیں اور مدارس میں باقاعدہ طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ پھر نویں اور دسویں جماعت والے طلبہ کا بورڈ کا امتحان ہوتا ہے اس کے بعد طلبہ اپنے لئے کسی فن کا انتخاب کر کے متعلقہ فن کے ادارے میں پڑھتے ہیں۔ اگر اس ادارہ میں مختلف فنون پڑھائے جاتے ہوں تو متعلقہ فن کے شعبہ میں چلے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو بنیادی لیول تک یکساں نصابِ تعلیم کی بات کی جاتی ہے وہ مدارس میں

رائج ہے البتہ عصری اداروں میں کچھ دینی مضامین داخل کرنا ضروری ہے تا کہ بچے بنیادی اسلامی تعلیم سیکھ جائیں۔

بالفرض اگر دسویں جماعت کے بعد بھی یکساں نصاب کی بات کی جائے یعنی ایک ایسا نصاب مرتب کیا جائے جس کی رو سے یونیورسٹیوں سے پروفیسروں وغیرہ کی طرح علماء نکلیں اور مدارس سے علماء کی طرح ڈاکٹر، پروفیسر وغیرہ نکلیں تو یہ نصاب نہ تو پروفیسروں کو منظور ہوگا اور نہ اہلِ مدارس کو اور نہ ہی یہ مناسب ہوگا۔ یونیورسٹیوں والے کبھی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے کہ یونیورسٹیوں میں فقہ، اصول، صرف، نحو وغیرہ نصاب کے طور پر پڑھائے جائیں، اسی طرح اہلِ مدارس بھی مدارس میں متعلقہ فنون کے علاوہ دوسرے فنون پڑھنے کو تیار نہیں ہونگے اور سب یہ عذر پیش کرینگے کہ اس طرح کرنے سے طلبہ ایک فن میں بھی راسخین نہیں ہونگے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ ایک علم بھی مضبوطی سے حاصل نہیں کر سکیں گے۔ دیکھیں اگر ایک طالب علم فقط ایک اعلیٰ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو اس کو کتنے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے یا ایک طالب علم فقط ایک مضبوط عالم بننا چاہتا ہے تو اس کو کتنی دیر تک راتوں کو بیٹھنا پڑتا ہے پس اگر اس طالب علم کو دو تین فنون ایک ساتھ سیکھنے پڑیں تو اس شعر کا مصداق بنے گا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ۔۔۔ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

لہٰذا مکمل طور پر یکساں نصابِ تعلیم نہ تو مفید ہے اور نہ ہی مانا جائے گا۔

آٹھواں اشکال

﴿مدارس فرقہ واریت کو فروغ دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں عوام آئے روز دست و گریباں ہوتے ہیں﴾

جواب: کسی بھی دعوی کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس دلیل کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ کس دلیل کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ مدارس فرقہ واریت کو فروغ دیتے ہیں؟ مدارس کے نصاب کو دیکھیں یہ تو قرآن و حدیث اور اس کے متعلقہ فنون پر مشتمل ہے جو کہ سراپا امن و امان کا درس دیتے ہیں۔ مسلمان کو مسلمان کا بھائی قرار دیتے ہیں اور کافر ذمی کی جان و مال کی حفاظت کا درس دیتے ہیں، البتہ کفار کے عقائد اور ان کے منصوبوں سے خبر دار کرتے ہیں اور یہ انتہائی ضروری بھی ہوتا ہے تاکہ مسلمان محفوظ رہیں اور ان کے اسلام دشمن منصوبوں کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ جس طرح ایک مملکت اپنی مخالف مملکت کے عزائم سے اپنے شہریوں کو آگاہ کرتی ہے۔ مثلاً وطنِ عزیز میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جن کو بھارتی عزائم کی کچھ نہ کچھ معلومات بھی نہ ہوں۔ اگر یہی ذہنیت بنانا فرقہ واریت ہے تو شاید کوئی ریاست ایسی نہیں ہوگی جو کسی درجہ میں فرقہ واریت میں ملوث نہ ہو۔

باقی مسلمانوں کے اندر جو اختلافات ہوتے ہیں وہ فروعی اختلافات ہوتے ہیں ان فروعی اختلافات میں ایک مسلمان کو اگرچہ ایک خاص نظریہ دیا جاتا ہے، لیکن یہ فقط ذہنیت بنانے تک محدود ہوتا ہے جو کہ صدیوں سے آرہے ہیں ان کی وجہ سے کوئی تشدد پیدا نہیں ہوتا بلکہ جیسا کہ گزرا کہ ہر مسلمان کو بھائی قرار دیا جاتا ہے۔

یہ اختلافات فقط مذہبی لوگوں کے اندر نہیں ہوتے بلکہ شعبہ زندگی کے ہر طبقہ فکر کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ سیاسی پارٹیاں برسرِ عام ایک دوسرے کی خامیاں بیان کرتی ہیں لیکن تشدد کا راستہ نہیں بتاتیں۔ باقی اگر ایک دو واقعے ایسے ملیں جن سے معلوم ہوتا ہو کہ فرقہ واریت کی پشت پر اہلِ مدارس ہیں تو اس کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ حکم شاذ و نادر امور پر نہیں لگایا جا سکتا اور نہ ہی شاذ و نادر پیش آنے

والے امور کے لیے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ اگر وطنِ عزیز کے مختلف اداروں میں آئے روز مختلف النوع فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ ادارے موردِ الزام نہیں ٹھہرائے جاتے تو فقط ایک دو واقعوں کی وجہ سے اہلِ مدارس کو موردِ الزام ٹھہرانا ناانصافی ہے دیکھیں کراچی میں پشتو سپیکنگ اور اردو سپیکنگ کی آڑ میں سالہا سال بوری بند لاش کلچر کو فروغ دیا گیا! کیا یہ اہلِ مدارس تھے؟ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں وقتاً فوقتاً غنڈہ گردی کے واقعات ہوتے ہیں! کیا یہ علماء ہیں؟

اسی طرح انتخابات کے دوران سیاسی پارٹیوں کے کارکنان کے درمیان کتنے جھگڑے وفسادات ہوتے ہیں، ایک گھر کے اندر بھائی بھائی کا اور والد بیٹوں کا مخالف بن جاتا ہے بلکہ بعض سیاسی جماعتوں کی بنیاد ہی فرقہ واریت پر مبنی ہے کہ وہ فقط ایک زبان والے لوگوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ اس طرح سیکولر لابی آئے روز اسلام، علماء اور مدارس کے خلاف میڈیا کے ذریعہ سے زہر پھیلاتے رہتے ہیں جو کہ فرقہ واریت کیساتھ ساتھ آئینِ پاکستان کی بھی صریح مخالفت ہے، اس طرح کبھی ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کے تشخیص پر اشکال کرتا ہے اور مریض کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، ایک انجینئر دوسرے انجینئر کے نقشہ پر اعتراض کرتا ہے تو ان سب پر یہ اشکال کیوں نہیں بنتا؟

نواں اشکال

﴿علما چندہ کرکے دوسروں کے رحم وکرم کے لیے پڑے رہتے ہیں﴾

جواب: عام حالت میں چندہ وسوال کرنا اس وقت قبیح ہے جبکہ اپنی ذات کے لیے ہو ورنہ رفاہی کاموں کے لیے چندہ تو ایک بہتر عمل ہے اور مدارس کے علاوہ دیگر مختلف النوع کاموں کے نام سے بھی چندے کیے جاتے ہیں مثلاً ہسپتال کے لیے، ٹرسٹ وڈیم وغیرہ کے لیے، بلکہ

حکومتیں تو عوام سے جبراً بڑے بھاری ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

لٰہذا اہلِ مدارس کا چندہ چونکہ قوم کے بچوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے ہوتا ہے اس لیے یہ بھی ایک بہتر عمل ہے، البتہ چندوں میں خیانت ایک انتہائی مذموم امر ہے۔ اگر علما کے رویوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان میں خیانت کے مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ وہ ایک کثیر تعداد طلبہ کے لیے معاوضہ کے بغیر کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، اساتذہ کے اخراجات برداشت کرتے ہیں، بڑی بڑی زمینیں خرید کر عمدہ تعمیرات کرتے ہیں اور بعض مہتممین طلبہ کو نقد وظیفہ بھی دیتے ہیں۔ جبکہ ایک سرکاری نوکر چار پانچ بچوں کی پرورش کی خاطر ایک معتد بہٖ تنخواہ کے باوجود قرض دار رہتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو انسانوں کی ضروریات ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، زمیندار اپنی فصل بیچنے کے لیے خریدار کا محتاج ہوتا ہے، حکومت سرکاری لوگوں کی تنخواہوں کا ایک معتد بہٖ حصہ عوام کے ٹیکسوں کے ذریعے سے پورا کرتی ہے، پرائیویٹ سکول کا مالک بھاری فیس وصول کرکے معاش کا مسئلہ حل کرتا ہے جبکہ بعض عہدیداران کرسی و ڈنڈا کے ذریعہ ظلماً رشوت بھی وصول کرتے ہیں۔ تو ان حالات میں اگر ایک مسلمان عزت کے ساتھ خفیہ طور پر اپنی خوشی و رضامندی سے ایک عالم کو کچھ رقم اس لیے دے کہ یہ دین کی خدمت میں مشغول ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟

جہاں تک عزت کی بات ہے تو اگر علما کو دیکھا جائے تو وہ معاشرہ میں عزت منداور لوگوں کے معتمد ہوتے ہیں مدارس کا اتنا بڑا نیٹ ورک عوام کے چندہ سے چلانا خود عوام کا ان پر اعتماد کی دلیل ہے۔ اسی طرح عوام عام دینی مسائل میں اور اپنے کام سے متعلق دینی

رہنمائی میں ان پر اعتماد کرتے ہیں، ان کے اجتماعات میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ حاضر ہوتے ہیں۔

علمائے کرام کی عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ ان کی عزت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے جس کا اندازہ مشائخ کے جنازوں سے لگایا جاسکتا ہے، جبکہ ایک عہدیدار کی عزت اس وقت تک ہوتی ہے جبکہ وہ عہدہ پر برقرار ہو، عہدہ سے برخاست ہونے کے بعد اس کی وہ عزت باقی نہیں رہتی۔ نیز عہدہ کے وقت اس کی جو عزت ہوتی ہے وہ بھی اکثر حقیقی عزت نہیں ہوتی بلکہ مفاد کی خاطر ہوتی ہے۔

نظریہ سیکولرازم کے کچھ خدوخال

ہر قوم وملک کے افراد کسی نہ کسی نظریہ کے تحت ہی زندگی گزارتے ہیں، مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں اور نظم وضبط چلاتے ہیں اور اپنے اہداف کو پورا کرنے کے درپے ہوتے ہیں کیونکہ انسان کی ساخت ایسی ہے کہ وہ کسی نظریہ کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کی ساخت قوتِ عقلیہ، قوتِ شہویہ اور قوتِ غضبیہ کا مجموعہ ہے۔ ہر قوت کا ایک اثر ہوتا ہے اور وہ کسی نہ کسی نظریہ کا داعی ہوتا ہے۔ قوتِ عقلیہ انسان کو اپنی فطرت کے مطابق کاموں پر آمادہ کرتی ہے، قوتِ شہویہ اس کو بے حیائی پر آمادہ کرتی ہے جبکہ قوتِ غضبیہ اس کو ظلم پر آمادہ کرتی ہے۔

چونکہ انسان میں دو قوتیں (شہویہ وغضبیہ) ایسی ہیں کہ وہ انسان (جب کہ انسان کی عقل ان سے مغلوب ہو جائے) کو برے افعال میں مبتلا کرتی ہیں اس لئے دنیا کے اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں اور بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی یہ دو قوتیں عقل کے تابع ہوتے ہیں اور وہ عفت وحیاء اور رحم جیسی صفات سے

متصف ہوتے ہیں ،وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تابعداری کرتے ہیں اور یہ دو قوتیں جب عقل پر غلبہ پاتی ہیں تو پھر یہ عقل کے خلاف ایک دوسرے کے آلہ کار بن جاتی ہیں۔یعنی شہوت پورا نہ ہونے کی صورت میں قوتِ غضبیہ حرکت میں آجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ تمام کفار آپس میں اختلافات کے باوجود اسلام کے خلاف ایک ہوتے ہیں۔

اگر ان قوتوں کے اثرات سے آج کے دور کو سامنے رکھتے ہوئے یہ تعبیر کیا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا کہ قوتِ عقلیہ فطرت کا تقاضہ کرتی ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے اس لئے عقل اسلام پر آمادہ کرتی ہے،اور قوتِ شہویہ مفاد پرستی کا تقاضہ کرتی ہے اور سیکولرازم میں ذاتی مفاد بہتر طور پر حاصل ہوتے ہیں اس لئے قوتِ شہویہ سیکولرازم پر آمادہ کرتی ہے اور قوتِ غضبیہ ظلم کا تقاضہ کرتی ہے اور دہشت گردی میں ظلم ہوتا ہے اس لئے یہ دہشت گردی پر آمادہ کرتی ہے،یااس کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ عقل فطرت کو چاہتی ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے اور شہوت آزادی کو چاہتی اور سیکولرازم میں آزادی ہوتی ہے کہ عوام جس طرح چاہیں اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزاریں اور حکومت ان کے ذاتی کاموں میں مداخلت نہ کریں۔خواہ وہ ماں و بہن سے زنا کریں یا اجنبی عورت سے رضامندی کی صورت میں زنا کریں،ماں فقر کے مارے مر رہی ہو یاوالد بے سہارا پڑا ہو اور بچہ عیاشی پر ایک خطیر رقم ضائع کرتا ہو لیکن حکومت ان سے کوئی غرض نہ رکھے اور یہی آزادی جانوروں میں ہوتی ہے۔جنگل جانوروں سے بھرا پڑا ہوتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ باپ کون ہے ،بیٹی کون ہے،ماموں کون ہے،ماں اور باپ بھوک کے مارے مر رہے ہوں وغیرہ۔

اور غضب ظلم پر آمادہ کرتی ہے اور دہشتگردی میں ظلم ہوتا ہے چونکہ انسان کی ساخت ہی میں یہ تینوں قوتیں مرکوز ہیں اس لئے وہ ملکی نظام چلانے میں کسی نہ کسی نظریہ کو

اپنائے گا خواہ وہ فطرت کے موافق ہو(جو اب اسلام ہے اور اسلام سے پہلے دوسرے ادیان الہٰی تھے) یا مفاد پرستی کی بناء پر ہو(جو پہلے کمیونزم وغیرہ کی صورت میں تھی اور اب سیکولرازم کے صورت میں ہے۔) یا دہشتگردی کے زور سے ہو(جو پہلے بھی اور اب بھی کفار بذاتِ خود کرتے ہیں یا ان کے ایماء پر برائے نام مسلمان کرتے ہیں۔) پھر یہ نظریہ جن کے اندر جس قدر مستحکم یا کمزور ہو گا اسی قدر ان سے یہ افعال بھی صادر ہوں گے۔

اگر یہ نظریہ قوتِ عقلیہ کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہوا تو یہ بہت عمدہ ہو گا پھر اس کی وجہ سے ایک قوم ایسی ترقی کرے گی اور اس کو وہ امن و امان حاصل ہو گا جس کی نظیر نہیں ملے گی اور وہ ایک غالب قوم ہو گی بشرطیکہ اس نظریہ (عقل و اسلام) سے متعلق افعال کو مکمل طور پر اختیار کرے اور اگر جزوی طور پر اختیار کرے تو جزوی ترقی کرے گی اور جزوی خوشحالی پائے گی۔ اور اگر یہ نظریہ قوتِ شہویہ اور قوتِ غضبیہ کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہو جائے تو مفاد پرستی اور جبر و ظلم ہو گا امن و امان ایک خواب ہو گا ،جیسا کہ قوتِ شہویہ کے غلبہ کی وجہ سے زمانۂ قریب میں مختلف نظریات و تصورات کو عروج ملا اور انہیں ایسا اچھالا گیا کہ گویا اس کے علاوہ کوئی نظریہ بہتر ثابت ہو ہی نہیں سکتا اور پھر قوتِ غضبیہ کے غلبہ کی وجہ سے ان نظریات کو جبری طور پر مسلط کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کا خون بہایا گیا۔ مثلاً آج سے کچھ عرصہ پہلے دو تصورات بہت مقبول تھے ایک کمیونزم اور دوسرا کیپیٹلزم۔

جمہوریت ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ تعیش کا دوسرا نام تھا اور لبرل ہونا دراصل معاشرے کو کھلی چھٹی دیکر سرمایہ دار کو کھیل کھیلنے کا موقع دینا تھا وہ جمہوریت، لبرل ازم اور سیکولرازم کو استحصال کی علامتیں تصور کرتے ہوئے ان سے نفرت کرتے تھے لیکن آج وہ بھی ان تصورات کو نقصان دہ قرار دیکر ذلت و رسوائی کی موت مرنے والے ہیں اور اس

سے پہلے بھی کئی نظریات دب چکے ہیں اور جن تصورات سے وہ نفرت کرتے تھے آج وہ عروج پر ہیں اور ریاستی نظام کو منظم کرنے کے لیے فقط انہی تصورات کو کارآمد سمجھتے ہیں، ان ہی تصورات و نظریات میں سے ایک سیکولرازم ہے جو کہ موضوعِ سخن ہے۔

سیکولر مذہب و نظریہ کا مطلب

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے لیے امن، تحفظ، انصاف اور بلند معیار زندگی کے اصول کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر کسی امتیاز کے بغیر تمام شہریوں کو ریاست کا مساوی رکن تسلیم کیا جائے اور نظریاتی مقاصد کے بجائے ریاست کو انسانوں کی دنیاوی زندگی بہتر بنانے کا ذریعہ قرار دیا جائے، ریاست کو صرف ان معاملات میں دخل اندازی کی اجازت ہونی چاہیئے جنہیں غیر جانب دارانہ اور معروضی سطح پر رکھا اور جانچا جاسکے۔ عقیدہ کو انفرادی زندگی اور انسانی ضمیر تک ہی محدود رکھا جائے اور کسی فرد یا ادارے کے لیے کسی دوسرے انسان کے عقیدے کی پرکھ ممکن نہیں۔ چنانچہ مذہب میں مداخلت یا کسی مذہب کی بالادستی قائم کرنا یا کسی مذہب کو غلط قرار دینا ریاست کا کام نہیں۔ سیکولر ریاست ان مقاصد کے حصول کے لیے فہم عامہ، اجتماعی مشاورت اور انصاف کے اصول بروئے کار لاتی ہے۔ سیکولر مذہب و نظریہ کا خلاصہ یہ ہوا کہ ریاستی نظم و ضبط اور قوانین عقل کی روشنی میں بنائے جائیں گے اور ریاست فقط اس صورت میں مداخلت کرے گی جب اس کے خود ساختہ نظم و ضبط، قانون اور مفاد پر حرف آئے۔

عقل کا دائرہ کار

اب رہی یہ بات کہ کیا مذہب کی رہنمائی کے بغیر فقط عقل کی روشنی میں ایسا نظم و ضبط اور قوانین بنانا ممکن ہے جو معاشرہ میں انصاف، امن، خوشحالی، ترقی اور بلند معیارِ

زندگی کا ضامن ہوں؟ تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ عقل ایک ایسی عظیم نامور نعمت ہے کہ گویا یہ ہی انسان کی پہچان ہے، کیونکہ عقل ہی کی وجہ سے انسان جانوروں سے ممتاز اور ان کو مسخر کرنے والا ہے اور یہ مختلف قسم کے ایجادات و تحقیقات عقل ہی کا کرشمہ ہے۔

عقل کے ان کرشموں سے انکار ممکن نہیں، لیکن اگر کوئی فقط عقل کی روشنی میں عدل وانصاف، امن، وخوشحالی اور اطمینان وبلند معیار زندگی بنانا چاہتا ہے تو یہ ناممکن ہے الاّ یہ کہ عقل کو دینِ اسلام سے منور کیا جائے یعنی عقل کو اپنی اصل و فطرت (جو کہ دینِ اسلام ہے) پر چھوڑا جائے۔ اگر اس کو قوتِ شہویہ یا غضبیہ کے تابع بنایا جائے جو عقل کی اصل وفطرت میں سے نہیں تو پھر معاشرہ میں حیا ورحم ایک خواب ہی ہو گا جس طرح قوتِ شہویہ کی فطرت بے حیائی ہے اور قوتِ غضبیہ کی فطرت ظلم ہے لیکن اگر ان کو عقل کے تابع بنایا جائے تو پھر عفت و حیاء اور رحم و شجاعت جیسی عظیم صفات انسان کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ عقلوں میں نقصان، عقلوں میں تفاوت اور عقلوں کے فیصلوں اور تجزیوں میں تضادات کا پایا جانا بھی ایک حقیقت ہے ہماری عقلیں ایک محدود حد تک ادراک کر سکتی ہیں پھر اس کے بعد نابینا بن جاتی ہیں۔ اور ایک مخصوص زمانہ میں ادراک کر سکتی ہیں لیکن پھر زمانوں کے تغیرات کی وجہ سے ان کے اندازے جدا جدا ہوتے ہیں، ایک زمانہ میں ایک کام سمجھ سے بالاتر وناممکن سمجھا جاتا ہے اور اس کے کہنے والے کو رجماً بالغیب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن دوسرے زمانہ میں وہی کام سمجھ کے مطابق ممکن بلکہ عام ہوتا ہے اور اس عموم کی وجہ سے اس کے متعلق تفصیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں

ہوتی۔ مثلاً آج سے پانچ سو سال پہلے اگر یہ کہا جاتا کہ ایک زمانہ آئے گا جس میں ایک شخص دنیا کے ایک کونے سے براہِ راست دوسرے کونے میں ایک شخص کو دیکھ کر بات کرے گا تو شاید یہ بات سمجھ سے بالاتر اور ناممکن سمجھی جاتی اور کہنے والے کو راجم بالغیب کہا جاتا لیکن آج کے زمانہ میں یہ بات ایک عام دیہاتی کے لیے بھی عجیب نہیں ہے اسی طرح جنگی آلات وغیرہ جیسی دوسری چیزوں کا حال ہے۔

اسی طرح خود اصحابِ عقل کے اندازوں میں بھی کافی فرق پایا جاتا ہے اس لئے تو ایک عاقل دوسرے عاقل کو بے وقوف سمجھتا ہے یا اس کی بات کو کم فہمی وکم عقلی پر محمول کرتا ہے، ایک وقت میں ایک ہی چیز کے متعلق بعض اصحابِ عقل ایک قانون بناتے ہیں اور بعض دوسرا قانون بناتے ہیں حالانکہ ہر کوئی اپنے آپ کو انتہائی سمجھ دار و عقلمند قرار دیتا ہے پھر کچھ عرصہ بعد خود اپنے بنائے ہوئے قانون کو غلط قرار دے کر دوسرا، تیسرا قانون بناتے ہیں۔ پھر یہی عقل جب شہوت کے تابع بن جاتی ہے تو وہ ایسے فیصلے کرتی ہے گویا کہ وہ فیصلہ انسانی عقل کا کرشمہ ہے ہی نہیں کیونکہ وہ حیوانی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً مرد کا مرد سے نکاح درست قرار دینا وغیرہ۔

علاوہ ازیں ضرورت پیش آنے یا سہولت پیدا کرنے وغیرہ جیسی وجوہ کے بنا پر وقتاً فوقتاً عقل کی عقدیں کھل جاتی ہیں اور ہر دور کی ایجادات وتحقیقات کو اپنے وقت میں انتہائی معزز، قیمتی، منتہائے عقل اور حرفِ آخر شمار کیا جاتا ہے لیکن کچھ عرصہ بعد وہ ایجادات عجائب گھر کی زینت بن جاتی ہیں۔ یا کچرہ کنڈیوں اور کباڑ خانوں میں پڑی رہتی ہیں۔ اور وہ تحقیقات پتھر کے زمانے والے قرار دیکر فقط الماریوں کی زینت بن جاتے ہیں۔ اس طرح کبھی عقل ذاتی، مالی مفاد سے مرعوب ہو کر کوئی قانون بناتا ہے۔ مثلاً مغرب میں بینک

کرپسی کا قانون وغیرہ۔ لیکن جب مفاد پورے ہوتے ہیں یا اس میں رکاوٹ آتی ہے تو قانون کو ختم یا تبدیل کیا جاتا ہے۔ اور کبھی عقل قوتِ عضبیہ سے مغلوب ہو کر دہشت گردی کا فیصلہ کرتی ہے جیسا کہ امریکہ نے جاپان پر ایک ایٹم بم حملے میں تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار افراد ہلاک کیئے۔ اسی طرح کبھی عقل سیاسی مفاہمت کے بنا پر NRO کا فیصلہ کرتی ہے اور بعد میں پچھتاتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مفادات سے مغلوب عقل کے نزدیک کمیونیزم ہی سب سے اعلیٰ نظام تھا اور عقل نے جمہوریت اور سیکولرازم کو استحصال کی علامتیں قرار دی تھیں لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔

غرض یہ کہ آئے روز ہم کسی نہ کسی سابقہ عقلی فیصلہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس پر جرح و تنقید کرتے ہیں لیکن پھر بھی ریاستی نظم و ضبط اور قوانین میں اسلام کے خلاف فقط عقل کو مسیحا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مذاق بننے کی وجہ ہی یہی ہے کہ ہم نے عقل کو اسلام کے بجائے قوتِ شہویہ و قوتِ غضبیہ کے تابع کرایا تھا جبکہ اسلام کے احکامات فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں جو کہ ہر زمانہ میں لوگوں کی بہترین رہنمائی کرتے ہیں، کوئی ایسا قانون بتائیں جو اسلامی قانون سے متصادم ہو لیکن پھر بھی وہ مفید و نتیجہ خیز ثابت ہوا ہو ؟ اور اسلام کا کوئی ایسا قانون بتائے جو غیر مفید ہو یا وہ پہلے مفید تھا، اب مفید نہیں رہا؟

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میڈیا کی حد تک یا چند خود غرض لوگوں کی نظر میں اسلامی احکامات کے خلاف کوئی قانون بہتر ہو لیکن عمومی طور پر وہ قانون ریاست کے لیے نقصان کا باعث ہو گا۔ مثلاً سودی کاروبار، زنا، منشیات وغیرہ کے جواز سے متعلق مغربی ریاستوں میں جو قوانین ہیں ان کے نقصانات کا اعتراف خود کئی اہم مغربی عہدیداروں نے بھی کیا ہے۔ (جن کا تذکرہ طول کے خوف سے ترک کیا)۔

سیکولر ریاست کی بیان کردہ پہلی خوبی

سیکولر ریاست کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ مکمل طور پر تمام شہریوں کو ایک جیسی بہبود کی ضمانت دیتی ہے تو اس کے حوالہ سے یہ کہنا مناسب ہو گا کہ چونکہ اسلامی احکامات کے مطالعہ سے غفلت ہے اسی وجہ سے اسلامی نظام کے بجائے یہ فقط سیکولرازم کا حسن بتایا جاتا ہے حالانکہ اسلامی احکامات میں شہریوں کے حقوق تو کیا بلکہ جانوروں کے حقوق کا بھی مکمل و مفصل بیان ہے اسلام میں تو اقلیت کے قتل کی بھی سخت ممانعت آئی ہے حتی کہ اس کے قتل پر مسلمان کو قتل کیا جائے گا اور اسلام تو جانوروں کی بھوک اور تکلیف کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ہاں بعض امور اور عہدے ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے کچھ مخصوص شرائط درکار ہوتے ہیں۔اور جس جس میں وہ شرائط نہیں پائے جاتے تو اسے وہ عہدہ سپرد نہیں کیا جاتا، پھر ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ حکومت شہریوں میں فرق کرتی ہے اسکول میں استاد بننے کے لیے ایک مخصوص تعلیم شرط ہوتی ہے اگر کوئی تعلیم حاصل نہیں کرتا اور استاد بننا چاہتا ہے تو وہ ریاست کے بجائے اپنے آپ کو ملامت کرے۔

اسلامی ریاست میں بعض عہدوں کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہوتا ہے کیونکہ کافر وہ عہدہ اچھے طریقے سے سرانجام نہیں دے سکتا لہذا اگر ذمی مسلمان ہوئے بغیر وہ عہدہ طلب کرتا ہے تو بھی ریاست کے بجائے اپنے آپ کو ملامت کرے۔ڈاکٹر کی پوسٹ پر انجنیئر یا وکیل لگانا کہاں کا انصاف اور حقوق کی برابری ہے ؟ اس طرح اگر ایک سیکولر ریاست یہ ضروری سمجھتی ہے کہ وہ فرضی دہشتگردوں کو عوام پر واضح کرے اور ان کو سزا دے۔ تو کیا اسلامی ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں دہشت

گردوں کے خلاف جہاد کرے؟ سیکولر ریاستوں میں آزادی اظہار رائے برائے نام ہے، کیا وہاں مسلمانوں کو اپنے مقدس فریضہ جہاد کی بات تک کرنے کی اجازت ہے؟ کتنے ملکوں میں وقتاً فوقتاً حجاب پر پابندیاں لگیں وغیرہ، حالانکہ یہ پابندیاں مسلمان کی رائے کے خلاف ہے۔ سیکولر طرز پر ریاست چلانے والوں میں مصطفیٰ کمال اتاترک کا نام سر فہرست ہے اور ساتھ ہی اس کی مسلمانوں پر پابندیاں بھی سر فہرست ہیں۔

سیکولر ریاست کی بیان کردہ دوسری خوبی

سیکولر ریاست کی ایک بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہاں کسی عقیدہ پر پابندی نہیں ہوتی جبکہ اسلامی ریاست میں عقیدہ پر جبر کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی اسلامی احکامات سے بے خبری یا ہٹ دھرمی کی بنا پر کی جاتی ہے۔ اسلام میں اقلیتوں کے حقوق، معاملات، عبادات کی مکمل تفصیلات موجود ہیں، اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اقلیت کی جان ومال کی حفاظت کرے اور انہیں اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کی اجازت دے اور ان کو مسلمان بننے پر مجبور نہ کرے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔لا اکراہ فی الدین۔"دین میں کوئی جبر نہیں ہے"۔ لیکن ہمارے ہاں یہ المیہ ہے کہ کچھ لوگ جدید علوم (سائنس وغیرہ) کو قدیم طریقہ سے سیکھتے ہیں کہ شاگرد استاد کے پاس کسی کالج ویونیورسٹی میں دو زانو بیٹھ کر علم حاصل کرتا ہے اور جن چیزوں کے متعلق علم نہ ہو تو اس بات کے اعتراف میں عیب محسوس نہیں کرتا کہ یہ بات مجھے معلوم نہیں اور قدیم علوم قرآن و حدیث وغیرہ کو جدید طریقہ سے سیکھتے ہیں کہ استاد کے بغیر اصولِ دین سے مناسبت نہ ہونے کے باوجود کسی عربی عبارت کا ترجمہ دیکھ کر فتوی لگاتے ہیں اور دین کے معاملہ میں ان لوگوں سے اپنے آپ کو سمجھ دار سمجھتے ہیں جنہوں نے اپنی عمریں اس دینی علم کے لیے

وقف کی ہیں۔ اور قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ کی اس طرح تشریح کرتے ہیں جو ان کے مفاد کے مطابق ہو۔

بہر حال اسلامی ریاست میں کسی کو اسلام لانے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ جو مرد اسلام لانے کے بعد بھی اس عظیم نعمت سے بے رخی اختیار کر کے اس کو چھوڑ دے اور مہلت دینے کے باوجود بھی وہ دوبارہ اسلام کو قبول نہیں کرتا تو اسلام کے قانون کے مطابق یہ باغی ہے اور اس کی سزا قتل ہے جیسا کہ سیکولر ریاستوں نے لاکھوں لوگوں کو اس لئے قتل کیا کہ وہ ان کے قانون و سوچ کے مطابق باغی، ریاست کے لیے خطرناک یا دہشتگرد تھے وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے کہ سیکولر ذہنیت رکھنے والے حضرات کیوں اس کھوکھلے نظام کو غنیمت سمجھتے ہیں؟ کیا وہ اسلامی تعلیمات سے ناآشنا ہیں؟ مسلمانوں کی صدیوں پر محیط روشن تاریخ سے بے خبر ہیں؟ یا مسلمانوں کی موجودہ حالت کے تناظر میں یہ رجحان پیدا ہوا ہے؟ بندہ کے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں بلکہ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ یہ لوگ مادی طور پر مغرب سے مغلوب ہونے کے بنا پر سیکولرازم کو غنیمت سمجھتے ہیں دوسری یہ کہ ان پر قوتِ شہویہ غالب آچکی ہے اور یہ مفاد پرست بن چکے ہیں اس لئے وہ سیکولرازم کو پسند کرتے ہیں حالانکہ یہ سیکولرازم اب مغرب کی مجبوری ہے۔ کیونکہ اہلِ مغرب پر قوتِ شہویہ اس قدر غالب آچکی ہے کہ ان کی اصلی فطرت اپنا وجود کھو بیٹھی ہے۔ اب ان کو اگر اسلام کے حسین فطری قانون اور نظم و ضبط کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے تو وہ بغاوت پر اتریں گے اور ریاستوں کے ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔ تو وہ اپنی مجبوری کو چھپانے کے لیے اس نظام کی تعریفیں کرتے ہیں اور ساتھ ہی اسلامی نظام کی خود ساختہ قباحتیں بیان کرتے ہیں حالانکہ اب

دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے بہترین رہنما ہے۔ اسلام کی یہ قباحتیں بیان کرنا اور اس نظام کی ناکامی کی کوشش کرنا بھی ان کی مجبوری ہے کیونکہ اگر کہیں صحیح معنوں میں اسلامی ریاست قائم ہو جائے اور لوگ اس کے حسن کو دیکھیں تو اس نظام کا نعرہ بلند ہونا شروع ہو گا جو کہ ان کی مفادات کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس رسالہ کو عوام و خواص کے لیے مفید بنائے اور ہم کو خود رائی کے دلدل سے نکال کر رائے کو دیکھنے، احترام کرنے اور درست معلوم ہونے کی صورت میں قبول کرنے والے بنا دے۔

بندہ صفی اللہ صفدرؔ

جامعہ زکریا دار الایمان و تقویٰ کربوغہ شریف

۲۷ شعبان ۱۴۴۱ھ ....21 اپریل 2020ء